Regd. L. No.7243

Phone 880800

قرآنی نظام ربوبیّت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1981

اس پرچہ میں :-

ہماری تاریخ میں کیا ہے؟

اگلے پرچہ میں :-

قرآن مجید کسطرح جمع اور مرتب ہوا تھا؟

شائع کردہ ادارۂ طلوعِ اسلام - ۲۵ بی - گلبرگ - لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

بدلِ اشتراک	ٹیلی فون	قیمت فی پرچہ
سالانہ پاکستان -/۳۶ روپے غیر ممالک -/۸۶ روپے	۸۸۰۸۰۰ خط و کتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور	۳ تین روپے
جلد ۳۴	دسمبر ۱۹۸۱ء	شمارہ ۱۲

فہرست

۱۔ لمعات ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۲

۲۔ ناکامی کی اصلی وجہ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۹

۳۔ عالمگیر انسانیت کے لئے منشورِ حیات ــ ــ (محترم پرویز صاحب) ــ ــ ۱۰
(حضور نبی اکرمؐ کا خطبہ حجۃ الوداع)

۴۔ مطالب الفرقان ۔ جلد چہارم ــ ــ ــ ــ ــ ۱۷

۵۔ ہماری تاریخ میں کیا ہے؟ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۱۸

۶۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک ــ ــ ــ ــ ــ ۴۵

۷۔ تصوّف کی حقیقت ــ ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۴۷

۸۔ قرآنی درس کے اعلانات ــ ــ ــ ــ ــ ــ ۴۸

۹۔ میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے! ــ ــ (محترم پرویز صاحب) ــ ــ ۴۹

ایڈیٹر محمد خلیل۔ ناشر شیخ عبدالحمید۔ مقام اشاعت۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور۔ مطبوعہ۔ اشرف پرنٹنگ پریس ۹/ ایبک روڈ۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

لمعات

اے افرادِ ملّتِ اسلامیہ! تمہاری رگوں میں خون نہیں، تڑپنے اور مچلنے والی بجلیاں ہیں جو جل کے ہر خس و خاشاک کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیں گی۔ تمہارے سینے متاعِ ملّی کے امین ہیں۔ دنیا کی کوئی طاقت اس امانت کو تم سے چھین نہیں سکتی۔ ہم نے دنیا کے رو باہ بازانِ ازلی سے بارہا کہا کہ اس شیرِ نیستاں کو سویا رہنے دو۔ اسے مت چھیڑو۔ اسے مت اٹھاؤ۔ یہ جاگ اٹھا تو دنیا میں قیامت برپا کر دے گا۔ پھر تمہیں نہ زمین میں پناہ ملے گی نہ آسمان پر۔ تم اپنی جانیں بچانے کے لئے دنیا کی ہر طاقت سے پناہ طلب کرو گے لیکن کوئی طاقت تمہاری مدد کے لئے نہیں پہنچ سکے گی۔ اس لئے کہ دنیا جانتی ہے کہ اس ضیغمِ یزدانی اور اسد غابۂ صمدانی سے پنجہ فگنی کے معنی خودکشی کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن ان ناعاقبت اندیشوں نے ہماری اس پکار کو محض ہنسی سمجھا۔ اے میری قوم کے جسور و غیور نوجوانو! تم کفرو باطل کے ان پجاریوں کے اس مردود چیلنج کو آگے بڑھ کر قبول کرو۔ اٹھو! بیدار ہو جاؤ اور دنیا کی ان ناہنجار قوتوں کو بتا دو کہ

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

اس میں شبہ نہیں کہ دشمن کے پاس ساز و سامان ہے۔ اس کے ہاں جیوش و عساکر ہیں۔ اس کے پاس فلک شگاف اسلحہ ہے۔ لیکن جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں۔ تمہارے سینے میں توحید کی امانت ہے۔ تمہارے بازوؤں میں حیدری قوّت ہے۔ تمہاری نگاہوں میں فاروقی دبدبہ ہے۔ تم میں شانِ قلندری ہے۔ دنیا کو اپنے ساز و یراق پر بھروسہ ہے۔ تمہیں اپنے ایمان پر اعتماد ہے۔ اور ایمان کی قوّت وہ ہے جس کے سامنے دنیا کی کوئی قوّت ٹھہر نہیں سکتی۔

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ		مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

ہم جانتے ہیں کہ دشمن ہماری تخریب کے لئے کیا کیا سازشیں کر رہا ہے۔ لیکن اسے معلوم نہیں کہ ہمارے پاس چودہ سو سال کی شجاعت و بسالت کی روایات ہیں۔ ہم نے تہیّہ کر لیا ہے کہ ہم

اپنی مملکت کے سفینہ کو سمندر کی ان خوفناک تلاطم انگیزیوں سے صاف بچا کر ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔ ہماری کشتی بڑی مضبوط ہے۔ اس کے چپو ان نبرد آزماؤں کے ہاتھ میں ہیں جو اللہ کے سوا کسی کے آگے نہیں جھکتے۔ اسلام خدا کا دین ہے اور خدا کی طرح ہمیشہ قائم رہنے والا۔ ان دشمنانِ ازلی کو معلوم ہونا چاہیئے کہ اگر انہوں نے ہمارے مقدس مقامات کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو ہم ان کی آنکھ نکال دیں گے۔ ان کی یہ مذموم حرکات ہمارے، بلکہ تمام عالمِ اسلام کے عزم کو پختہ سے پختہ تر کئے جاتی ہیں۔ ہمارے نزدیک ہمارے مذہب کی قیمت ہمارے جان مال، عزت آبرو۔ زن و فرزند ہر شئے سے زیادہ ہے۔ اس لئے اللہ کے دین کی حفاظت کے لئے ہم یہ سب کچھ قربان کر دیں گے۔ لہذا جو لوگ ہمارے خلاف مذموم ارادے رکھتے ہیں انہیں تھم کر سوچنا چاہیئے کہ ان کی راہ تباہی کی راہ ہے۔ ہم انہیں آخری مرتبہ تنبیہ کر دینا چاہتے ہیں کہ اپنی عافیت چاہتے ہو تو مسلمانوں سے اپنا ہاتھ اٹھا لو۔

یہ کسی احتجاجی جلسہ میں، کسی شعلہ بیان مقرر کی تقریر نہیں۔ یہ ہماری (اہلِ پاکستان کی) پوری تاریخ کا ملخص ہے۔ آپ ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک کے اخبارات اٹھا کر دیکھئے۔ ان میں ہمارے اربابِ اقتدار۔ دانشورانِ قوم، مقتدیانِ مذہب۔ شہپرانِ صحافت۔ مہرہ بازانِ سیاست کے بیانات، تقاریر، تحاریر، ارشادات کا عصارہ (نچوڑ) وہی نکلے گا جسے ہم نے چند الفاظ میں اوپر پیش کر دیا ہے۔

" بیت بازی" کا یہ سلسلہ تو سال بھر جاری رہتا ہے لیکن جب کوئی خاص تقریب منعقد ہوتی ہے تو الفاظ میں مخصوص سا تنوع پیدا ہو جاتا ہے۔ اس قسم کی تقاریب بالعموم (علامہ) اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی یاد میں منائی جاتی ہیں۔ پہلے علامہ اقبالؒ کے صرف یومِ وفات (۲۱ اپریل) کی تقریب منائی جاتی تھی۔ اب کچھ عرصہ اُدھر سے، ان کے یومِ پیدائش (۹ نومبر) کی تقریب بھی منائی جانے لگی ہے۔ ان تقاریب پر بھی کچھ اس قسم کے رٹے رٹائے الفاظ دہرا دیئے جاتے ہیں:۔

حکیم الامت، شاعرِ مشرق، مفکرِ اسلام، علامہ اقبالؒ نابغۂ عظیم تھے۔ انہوں نے اپنی آہِ سحرگاہی اور نالۂ نیم شبی سے اس امتِ خوابیدہ کو نہ صرف خوابِ مدہوش سے بیدار کر دیا بلکہ ان کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دوڑا دیا۔ لیکن وہ صرف ایک شاعر اور مفکر ہی نہیں تھے۔ (قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں) وہ ایک بلند پایہ سیاست دان بھی تھے۔ یہ ان کی سیاسی دور بینی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کے لئے ایک جداگانہ آزاد مملکت کا تصور دیا۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ مملکت مقصود بالذات نہیں ہو گی بلکہ ایک عظیم آفاقی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہو گی۔ آیئے ہم آج عہد کریں کہ ہم اس مقصد کی تکمیل کے لئے جو اس مملکت کے حصول و قیام کی وجہِ جواز ہے، اپنی جان تک کی بازی لگا دیں گے۔

قائدِ اعظمؒ سے متعلقہ تقاریب میں ان کا یومِ پیدائش (۲۵ دسمبر) یومِ وفات (۱۱ ستمبر) یومِ پاکستان (۲۳ مارچ) اور یومِ آزادی (۱۴ اگست) سب شامل ہیں۔ ان تقاریب پر کچھ اس قسم کے الفاظ سمع نواز

ہوں گے۔

> یہ مبدأ فیض کا احسانِ عظیم تھا کہ اس نے ہم میں قائدِ اعظمؒ جیسا عظیم مصلح اور سیاسی راہ نما پیدا کر دیا جس نے اپنے مومنانہ تدبر سے اقبالؒ کے خواب کو حقیقت بنا کر دکھا دیا اور ملتِ بیضا کو پاکستان جیسی قابلِ صد رشک مملکت کا وارث بنا دیا۔ ایسی عظیم کامیابی جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی، اس مردِ مومن کے حسنِ کردار، پاکیزگیٔ سیرت، بے لوث جذبۂ خدمت اور اپنے نصب العین کی صداقت پر یقینِ محکم کا نتیجہ تھی۔ اقبالؒ نے اس مملکت کا جو مقصود و منتہی شاعرانہ انداز میں بتایا تھا، قائدِ اعظمؒ نے اسے نہایت واضح الفاظ میں ....
>
> .... متعین طور پر دھرایا، اور بار بار دھرایا۔ ہمارا فریضۂ حیات یہ ہونا چاہیئے کہ ہم قائدِ اعظمؒ کے ارشادات کی تعمیل کے لئے اپنی جان، مال، وقف کر دیں تاکہ ہم ان کے ناخلف وارث نہ کہلائیں۔

آپ گذشتہ چونتیس سال کے اخبارات کے اوراق الٹ کر دیکھئے، ان میں آپ کو اس قسم کے الفاظ کے انبار لگے دکھائی دیں گے۔ اس کے ساتھ ہی آپ کو یہ عبرت انگیز نظارہ بھی دکھائی دے گا کہ ہم زبان سے یہ الفاظ بھی دہراتے جائیں گے اور عملاً اپنا ہر قدم ان کے خلاف اٹھائیں گے۔ اس مملکت کے مقصود و منتہی کے متعلق نہ تو اقبالؒ نے شاعرانہ رموز و کنایات سے کام لیا تھا اور نہ ہی قائدِ اعظمؒ نے کوئی مبہم، ذو معنی سیاسی زبان (DIPLOMATIC LANGUAGE) استعمال کی تھی۔ انہوں نے نہایت واضح، واشگاف الفاظ میں بتا دیا تھا کہ اس مملکت سے مقصود یہ ہے کہ تھیا کریسی (دورِ ملوکیت کی تخلیق، مذہبی پیشوائیت) سے جان چھڑا کر، یہاں خدا کی کتاب کی حکمرانی قائم کی جائے تاکہ اُمت کو صحیح آزادی نصیب ہو۔ اقبالؒ نے ۱۹۳۲ء میں قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا،

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطرت، ملاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوھام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے۔ اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی، سیاسی بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں، نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی امنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔ (انقلاب۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء)

انہوں نے اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس قسم کا انقلاب بڑی ذہنی جد و جہد کا متقاضی ہوگا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہو گا کہ

> اسلامی دنیا اس کی طرف عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ

کہنے کی جرأت نصیب ہوئی کہ ——— حسبنا کتاب اللہ ——— ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ (خطباتِ اقبالؒ۔ چھٹا خطبہ)

اسی خطبہ میں انہوں نے، اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اصول کے مسئلہ پر بڑی تفصیلی روشنی ڈالی ہے جس کا ملخّص یہ ہے کہ قرآن مجید کے حدود اور دوائر کے اندر رہتے ہوئے، اس مملکت کو اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خود قوانین وضع کرنے چاہئیں۔ کسی سابقہ زمانے کے فقہی قوانین کو حتمی اور قطعی سمجھ لینا، اسلام کے یکسر خلاف ہے۔ جب یہ فقہی قوانین مرتب ہوئے تھے، وہ زمانہ گذر چکا ہے۔

> اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوو ارتقا سے وجود میں آگئی ہیں۔ اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات و تاویلات کو کبھی قطعی، کامل، مختتم اور سہو و خطا سے مبرّی سمجھا تھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں، فقہ کے اصولِ اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقا ہے، اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل خود تلاش کرے۔ وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ لیکن اسلاف کے فیصلے ان کے راستے میں روک نہیں بن سکتے۔ (چھٹا خطبہ)

یہ تھا جو اقبالؒ نے اس مملکت میں قانون سازی کے سلسلہ میں کہا تھا۔

(۰)

قائدِ اعظمؒ نے انہی حقائق کو واضح تر الفاظ میں بیان کیا تھا۔ انہوں نے تحریکِ پاکستان کے آغاز ہی میں (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے، ۵ فروری ۱۹۳۸ء کو) واشگاف الفاظ میں کہا تھا کہ

> مسلم لیگ نے (کم از کم) ایک کام تو کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے۔..... اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ اس نے تمہیں اس ناخوش آئند عنصر (UNDESIRABLE ELEMENT) کی جکڑ بندیوں سے آزاد کرا دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔ (تقاریرِ قائدِ اعظمؒ حصہ اول۔ صـ ۴۸)

انہوں نے، تشکیلِ پاکستان کے بعد واضح کر دیا کہ اس مملکت میں نہ سیکولرازم کا نظام رائج ہو گا۔ اور نہ ہی "روایتی اسلام کا نظام" (طلوعِ اسلام۔ فروری ۵۹ء۔ صـ ۶۹)۔ اس "روایتی اسلام کے نظام" کا نام

تھیاکریسی ہے جس کے متعلق انہوں نے، اہلِ پاکستان ہی کو نہیں، ساری دنیا کو متنبہ کر دیا تھا کہ

پاکستان میں کسی قسم کی تھیاکریسی کارفرما نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(امریکہ کے باشندوں کے نام پیغام۔ فروری ۱۹۴۸ء)

اس سے پہلے مسلم لیگ کنونشن منعقدہ دہلی (۱۱ اپریل ۱۹۴۶ء) میں خود اپنی قوم سے کہا تھا کہ

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے یہ لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ یاد رکھئے! ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (طلوعِ اسلام۔ ستمبر ۱۹۷۲ء۔ صفحہ ۲۹)

ان مختصر سے اقتباسات سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ پاکستان کا مقصد، تھیاکریسی کو مٹانا تھا۔ تھیاکریسی کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ کسی زمانے کے فقہی قوانین کو ابدی اور غیر متبدل قرار دے کر، انہیں شریعتِ خداوندی کی حیثیت سے ملک میں (بطور قانونِ مملکت) نافذ کر دیا جائے۔

لیکن تھیاکریسی کا مٹانا، تو ایک منفیانہ عمل تھا۔ سوال یہ ہے کہ قائدِ اعظمؒ کے پیشِ نظر کس قسم کا نظام تھا جسے وہ پاکستان میں نافذ کرنا چاہتے تھے۔ اسے انہوں نے دو چار فقروں میں ایسی جامعیت سے حصارِ بند کر دیا تھا کہ اس سے اسلامی نظام کی صحیح اور مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔ انہوں نے (حیدر آباد۔ دکن میں) عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا کے ایک سوال کے جواب میں، کہا تھا:۔

اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہوتی ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول و ارکان کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

اس کے بعد وہ ساری تحریک کے دوران اس حقیقت کا بار بار اعلان کرتے رہے کہ اس مملکت کا آئین اور اس کے قوانین قرآنِ مجید پر مبنی ہوں گے اور قرآنِ مجید ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ انہوں نے ۱۹۴۵ء میں ملت کے نام پیغامِ عید کے سلسلہ میں فرمایا:۔

اس حقیقت سے ہر مسلمان واقف ہے کہ قرآن کے احکام مذہبی اور اخلاقی حدود تک محدود نہیں۔ مشہور مؤرخ گبن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "بحرِ اطلانٹک سے لے کر گنگا تک، ہر جگہ قرآن کو، ضابطۂ حیات کے طور پر مانا جاتا ہے۔ اس کا تعلق صرف الٰہیات تک نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کے لئے سول اور فوجداری قوانین کا ضابطہ ہے جس کے قوانین نوعِ انسان کے تمام اعمال و احوال کو محیط ہیں۔ اور یہ قوانین غیر متبدل منشائے خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ فرماتے ہیں:-

اس حقیقت سے سوائے جہلاء کے ہر شخص واقف ہے کہ قرآن مسلمانوں کا بنیادی ضابطہ زندگی ہے جو معاشرت، مذہب، تجارت، عدالت، فوج، دیوانی، فوجداری اور تعزیرات کے ضوابط کو اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ مذہبی رسوم ہوں یا روزمرہ کے معمولات۔ روح کی نجات کا سوال ہو، یا بدن کی صفائی کا۔ اجتماعی حقوق کا سوال ہو یا انفرادی واجبات کا۔ عام اخلاقیات ہوں یا جرائم۔ دنیاوی سزا کا سوال ہو یا آخرت کے مؤاخذہ کا ——— ان سب کے لئے اس میں قوانین موجود ہیں اسی لئے نبی اکرمؐ نے حکم دیا تھا کہ ہر مسلمان قرآنِ کریم کا نسخہ اپنے پاس رکھے اور اس طرح اپنا مذہبی پیشوا آپ بن جائے۔ (انہیں الگ مذہبی پیشواؤں کی ضرورت ہی نہیں)۔ (تقاریر۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۰۰)

قائدِ اعظمؒ ایک بلند پایہ ماہر قانون اور وسیع النظر آئین دان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ ایک مملکت اسی صورت میں جداگانہ مملکت قرار پا سکتی اور قائم رہ سکتی ہے جب اس میں ایک ضابطہ، قوانین ہو جس کا اطلاق ساری قوم پر یکساں ہو۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ پاکستان میں مختلف فرقوں کے مسلمان آباد ہیں جن کی فقہ اور احادیث الگ الگ ہیں۔ اگر ان کی فقہ اور احادیث کو قانون کا مدار قرار دے دیا تو ان سے ایک متفقہ علیہ ضابطہ، قوانین کبھی مرتب نہیں ہو سکے گا۔ ان کی نگاہوں میں اس کا علاج ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ قرآنِ مجید کو قانون کی بنیاد قرار دیا جائے جسے تمام فرقے کتاب اللہ تسلیم کرتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے نومبر ۱۹۳۹ء میں قوم کے نام پیغامِ عید میں کہا تھا کہ

جب ہمارے پاس قرآنِ کریم ایسی مشعلِ ہدایت موجود ہے تو پھر ہم اس کی روشنی میں ان اختلافات کو کیوں نہیں مٹا سکتے۔ (تقاریر۔ جلد اوّل۔ صفحہ ۱۰۸)

انہوں نے بار بار اس حقیقت کا اعلان کیا تھا کہ منتشر افراد، ایک قوم اسی صورت میں بن سکتے ہیں جب وہ ایک ضابطہ، قوانین کے پابند ہوں۔ اسی وحدتِ قانون سے ہر قسم کی تفرقہ بازی ختم ہو سکتی ہے۔ اسی بناء پر انہوں نے ۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکہ میں بحیثیت گورنر جنرل تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبجاتی تفریق ختم کیجئے ——— یاد رکھئے! صوبجاتی تفریق اور مذہبی فرقہ بندی ——— شیعہ، سُنّی، وغیرہ لعنتیں ہیں۔

(تقاریر بہ حیثیت گورنر جنرل۔ صفحہ ۸۴)

صوبجاتی تفریق تو ملکی قانون کی وحدت کی رُو سے ختم کی جا سکتی ہے۔ یعنی سارے ملک کو آئینی وحدت (UNIT) قرار دیتے ہوئے، سب پر ایک قانون منطبق کر دیا جائے۔ لیکن فرقہ وارانہ تفریق صرف اسی صورت میں ختم کی جا سکتی ہے کہ اس قانون کی اساس اور بنیاد، اس چیز کو قرار دیا جائے جو تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو۔ اور وہ صرف قرآنِ مجید ہے۔ اگر اس کے ساتھ فقہ احادیث (سنّت) کو بھی شامل کر دیا جائے تو آپ قیامت تک کوئی ایسا ضابطہ، قوانین مرتب نہیں کر سکتے۔

جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

زکوٰۃ سے متعلق قانون کی حالیہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ حکومت نے اسے قانونِ مملکت (پبلک لا) کی حیثیت سے نافذ کیا لیکن وہ چل ہی نہ سکا اور چند ہی روز کے بعد حکومت کو یہ کہنا پڑا کہ ہر فرقہ اپنی اپنی فقہ کے مطابق زکوٰۃ ادا کر دیا کرے۔ اس سے قانون کی وحدت ختم ہو گئی۔ اور قانون کی وحدت ختم ہونے کے ساتھ ہی قوم کی وحدت بھی ختم ہو گئی۔ وہ فرقوں میں بٹ گئی۔ یہی حشر ہر قانون کا ہو گا جسے آپ "کتاب و سنّت" پر مبنی قرار دیں گے۔ وہ کسی نہ کسی فرقہ کی سنّت کے خلاف ہو گا اور جس فرقہ کی سنّت کے وہ خلاف ہو گا وہ اسے چیلنج کر کے منسوخ کرا دے گا یا کم از کم اپنے فرقہ کو اس سے مستثنیٰ قرار دلا لے گا۔ اس کی "پبلک لا" کی حیثیت پھر بھی نہیں رہے گی۔ مودودی (مرحوم) کو بھی، جو "کتاب و سنّت" کے بہت بڑے داعی تھے، بالآخر، اقرار اور اعلان کرنا پڑا کہ "کتاب و سنّت" کی رُو سے پبلک لا کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔

یہ وجہ تھی جو اقبالؒ بھی "حسبنا کتاب اللہ" (واحد قرآنِ کریم) کو اسلامی مملکت کی اساس و بنیاد قرار دیتے تھے اور قائدِ اعظمؒ بھی اسی کو استحکامِ مملکت کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اور طلوعِ اسلام پہلے دن سے اس پر زور دیتا چلا آ رہا ہے۔

(۰)

یہ تھے اقبالؒ کے افکار اور قائدِ اعظمؒ کے وہ ارشادات جن کے متعلق، یہاں چونتیس برس سے مسلسل پکار پکار کر کہا جا رہا ہے کہ ہماری نجات و فلاح انہی کے اتباع میں مضمر ہے۔ یہ ہیں ہمارے اعلانات و نشریات، اور اس کے برعکس ملک کی عملاً جو حالت ہے اس کی بابت کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۲) "اے مسلمانو! تم وہ بات کہتے کیوں ہو جسے کر کے نہیں دکھاتے"۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۳) "اللہ کے نزدیک یہ بات انتہائی مذموم اور قابلِ نفرت ہے کہ تم وہ کچھ کہو جو کرو نہیں"۔ غور کیجئے یہ تنبیہ مسلمانوں (یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ....) سے کی گئی ہے۔ یعنی خدا یہ کچھ ہمیں کہہ رہا ہے۔

اس کے بعد ہمیں خود فیصلہ کرنا چاہیئے کہ قرآنِ مجید کی رُو سے ہمارا مقام کیا ہے۔

خریدار صاحبان خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ جواب میں تاخیر نہ ہو۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ لکھیں۔ اور پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ سے پہلے اطلاع دیں۔ (ناظمِ ادارہ)

ناکامی کی اصلی وجہ

محترم صدرِ مملکت نے، گذشتہ دنوں، مختلف مواقع پر، حکومت کی طرف سے نافذ کردہ قوانینِ شریعت کی ناکامی پر تاسف اور مایوسی کا اظہار فرمایا ہے۔ موقر جریدہ "جنگ" (لاہور) نے اپنی اشاعت بابت ۱۵؍ نومبر ۱۹۸۱ء کے اداریہ میں، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

> صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلامی نظریاتی کونسل کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اسلامی قوانین کے نفاذ میں سست روی پر جگر مندی کا اظہار کیا ہے۔ صدر نے کہا کہ کونسل کو اس بات پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اس کی پچھلی سفارشات پر مبنی قوانین ایک حقیقی اسلامی روح کے مطابق کیوں نافذ نہ ہو سکے۔ کونسل کو ایک تفصیلی تجزیہ کے ذریعے ان خامیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی کرنی چاہیئے جو ان قوانین کے نفاذ یا تشکیل کے عمل کے دوران سرایت کر گئی ہوں۔ صدرِ مملکت نے ایک بڑا اہم سوال اٹھایا ہے۔ اس پر صرف کونسل ہی کو نہیں، ہم سب کو اور حکومت کے ذمہ دار مناصب پر فائز تمام افراد کو غور کرنا چاہیئے اور ان اسباب کا پتہ چلانا چاہیئے جو قوانین کے نفاذ میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔

صدرِ مملکت کا یہ تاثر اور تاسف بجا اور درست لیکن ہم باادب گذارش کریں گے کہ ان قوانین کے نفاذ کی سست روی یا ناکامی کے اسباب خارج میں تلاش کرنا عبث ہے۔ اس کا بنیادی سبب خود ان قوانین کے اندر مضمر ہے۔ یہ (فقہی) قوانین، ہزار سال پہلے کے معاشرہ کے تقاضوں کے پیشِ نظر ماہرینِ قانون (انسانوں) نے مرتب کئے تھے۔ یہ اس زمانے کے حالات میں تو قابلِ عمل ہوں گے لیکن اب جبکہ دنیا بدل گئی ہے۔ قوم کے حالات بدل گئے ہیں، معاشرہ کے تقاضے بدل گئے ہیں، ان میں یہ قوانین چل کیسے سکتے ہیں؟ غیر متبدل اور ابدی اصول و احکام تو صرف خدائے علیم و حکیم کے نازل فرمودہ ہیں جو زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ انسان، خواہ وہ کتنے ہی بڑے ماہر کیوں نہ ہوں، ان کے وضع کردہ قوانین کبھی ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ یہ ہزار سالہ پرانے فقہی قوانین ہیں جنہیں اسلامی قوانین کہہ کر نافذ کیا جاتا ہے۔ یہ موجودہ حالات میں عمل پیرا کیسے ہو سکتے ہیں۔ اسلامی نظریاتی کونسل یا دیگر علمائے کرام سے یہ کہنا کہ وہ اصلاحِ احوال کی صورت پیدا کریں؛ خوش فہمی سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ صورتِ حال تو خود ان کی پیدا کردہ ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ ان قوانین میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں کیا جا سکتا۔ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو ہمیں (اس تصور سے سخت صدمہ ہوتا ہے کہ) ان کی ناکامی سے صدرِ مملکت کو مایوسی ہوگی۔ ان کی مایوسی قوم کے لئے مایوسی کا باعث بنے گی۔ اس ناکامی اور مایوسی سے قوم کا نوجوان طبقہ، جو ابھی سے اسلام کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہوتا جا رہا ہے، اس سے یکسر برگشتہ ہو جائیگا۔ اور اقوامِ عالم کے دل میں اسلام کے متعلق جو یہ خیال ابھر رہا ہے کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے، وہ یقین کا درجہ حاصل کر لیگا۔ سوچئے کہ یہ خود اسلام کے لئے کس قدر ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔

ہم اربابِ متعلقہ کی خدمت میں عرض کریں گے کہ وہ قانون سازی کی مہم کو سردست ایک طرف رکھ کر سب سے پہلے یہ طے کریں کہ

اسلام میں قانون سازی کے اصول کیا ہیں؟

اس کے لئے انہیں اقبالؒ کے ہاں سے واضح راہ نمائی مل سکے گی۔ یہ اصول طے کرنے کے بعد، جدید قوانین مرتب کرنے کا پروگرام شروع کیا جائے۔ یہ قوانین (جو قرآنی حدود کے اندر رہتے ہوئے مرتب کئے جائیں گے) ہمارے زمانے کے لئے اسلامی قوانین قرار پائیں گے۔ کسی خاص زمانے کے فقہی قوانین ہمیشہ کے لئے اسلامی نہیں قرار پا سکتے۔ نہ ہی وہ ہمیشہ کے لئے قابلِ عمل ہوتے ہیں۔

— (۰) —

عالمگیر انسانیت کے لئے منشورِ حیات

یعنی

حضورؐ نبی اکرمؐ کا

خطبۂ حجۃ الوداع

حج، ۹ھ میں فرض ہوا۔ اس سال حضورؐ خود تشریف نہیں لے گئے۔ بلکہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا۔ ۱۰ھ میں حضورؐ نے بہ نفس نفیس حج کا ارادہ فرمایا۔

اس خبر کا عام ہونا تھا کہ سارا عرب ہمرکابی کی سعادت حاصل کرنے کے لئے اُمنڈ آیا۔ ذی قعدہ کی چھبیسویں تاریخ، حضورؐ مدینہ منورہ سے جانبِ کعبہ روانہ ہوئے۔ مدینہ سے باہر چھ میل کے فاصلہ پر قیام فرمایا۔ دوسری صبح حضورؐ نے احرام باندھا اور بلند آواز سے فرمایا۔

لبیک اللّٰھم لبیک۔ لاشریک لک لبیک۔ ان الحمد والنعمۃ لک لبیک والملک لاشریک لک۔

ہم حاضر ہیں۔ اے ہمارے بزرگ و برتر تیرے بندے تیرے حضور حاضر ہیں۔ حمد و ستائش کی مرکز تیری ہی ذات ہے اس میں کوئی اور شریک نہیں۔ حکومت صرف تیرے لئے ہے۔ اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔

حضورؐ نے یہ کلمات بلند کئے اور سننے والوں نے سنا کہ لبیک اللّٰھم لبیک کی صدائے بازگشت سے تمام دشت و جبل گونج اُٹھے کہ یہ کاروانِ عشق و ذوق تمام دامنِ صحرا پہ ریت کے چمکتے ہوئے ذرّوں کی طرح تا بحدِ نظر پھیلا ہوا تھا۔ تقدیس و تحمید کی ان زمزمہ بازیوں سے یہ قافلہ، نور و نکہت منزل بمنزل آگے بڑھتا گیا۔ سینوں میں تڑپتے ہوئے دل۔ آنکھوں میں چمکتی ہوئی فراست۔ پیشانیوں میں مچلتے ہوئے سجدے۔ ذوقِ عبودیت کی متاعِ گراں اور آغوش۔ حسنِ عمل کی کامرانیوں اور سعی پیہم کی شادکامیوں کی ایک جنت اپنے جلو میں لئے، یہ زبدۂ کائنات گروہ، یہ عصارۂ روزگار جماعت۔ یہ جیش خدا مست

یہ عسکر خود آگاہ۔ یہ حریت و مساوات کے علم بردار۔ یہ احترام انسانیت کے پیغامبر۔ یہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ کے زندہ پیکر، ذی الحجہ کی چار تاریخ کو، صبح کے سہانے وقت، تاروں کی خنک و حسین

مکہ میں داخلہ

چھاؤں میں مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ جب کعبہ پر نگاہ پڑی تو حضورؐ نے وجد و مسرت کے والہانہ انداز میں فرمایا:۔

لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ لاشریک لہ۔ لہ الملک ولہ الحمد و یمیت وھو علیٰ کل شیءٍ قدیر۔ لا الٰہ الا اللہ وحدہٗ۔ انجز وعدہٗ۔ نصر عبدہٗ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔

(ہاں آج اس حقیقتِ کبریٰ کا عملی اعلان ہو رہا ہے کہ) خدا کے سوا کوئی حاکم اور آقا نہیں۔ اس کا کوئی شریک نہیں۔ سروری اور ستائش سب اس کے لئے زیبا ہے۔ وہی ہے جو زندگی عطا کرتا ہے اور وہی ہے جو موت دیتا ہے۔ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ اس خدائے واحد کے سوا کوئی حاکم نہیں (میرا سرِ نیاز اس کی بارگاہِ صمدیت میں جھکا ہے جس نے) اپنا وعدہ (یوں) پورا کیا۔ اس نے اپنے (بے سر و سامان) بندے کی مدد کی اور باطل کے تمام جیوش و عساکر کو شکست دے دی (اور حق کی اس طرح فتح ہوئی)۔

نویں ذوالحجہ کو جمعہ کے روز، یہ جمعیتِ اسلامیہ، یہ اُمّتِ قانتہ، یہ ملّتِ مسلمہ، یہ قدوسیوں کی جماعتؓ عرفات کے میدان میں جمع ہو گئی کہ اپنے امام و مقتدیٰؐ سے تشکیل حکومتِ الٰہیہ کا اعلانِ عظیم اپنے کانوں سے سن لیں تاکہ اس کے بعد اسے کامل حتم و یقین کے ساتھ دنیا کے کونے کونے تک پہنچا دیں۔ دوپہر ڈھل گئی تو کمبل کے خیمہ سے وہ ذاتِ گرامیؐ جلوہ بار ہوئی جس کے ایمان و عمل کے درخشندہ

خطبہ حجۃ الوداع

نتائج اس وقت یوں سامنے ضو فشاں تھے۔ حضورؐ ناقہ پر سوار ہوئے تو تکبیر کے غلغلہ انگیز نعروں سے فضا مرتعش ہو گئی۔ آپ نے ناقہ پر سوار وہ خطبہ ارشاد فرمایا جو تمام نوعِ انسانی کے لئے منشورِ بالغہ ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

الا! کل شیءٍ من امر الجاھلیۃ تحت قدمی موضوع۔

ہاں! جاہلیت کے تاریک زمانہ کے تمام آئین و دستور میرے پاؤں کے نیچے ہیں۔

اللہ اکبر! یہ اعلان اس کی طرف سے ہو رہا ہے جسے اس مقام سے، آج سے دس سال قبل، ان ہی آئین و دساتیر کے علمبرداروں نے چاروں طرف سے یورش کر کے نکالا تھا۔

اس کے بعد فرمایا:۔

ایھا الناس۔ الا ان ربکم واحد۔ وان اباکم واحد۔ الا لافضل العربي علی عجمی ولا لعجمی علی عربی۔ ولا لاحمر علی اسود و لا لاسود علی احمر۔ الا بالتقویٰ۔

اے نوعِ انسانی (سن رکھو کہ) تمہارا سب کا رب ایک ہے۔ اور تم تمام ایک ہی اصل کی

شاخیں ہو۔ اس لئے عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر۔ کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب۔

غور کیجئے، شرفِ انسانیت کی نمود و بالیدگی اور مزیت آدمیت کے عروج و ارتقا کی راہ میں سب سے بڑے سنگِ راہ، انسانوں کی جغرافیائی تقسیم (وطنیت) اور نسبی تفوق (نیشنلزم) کی حدود و قیود ہیں۔ اس لئے اس منشورِ حریت و مساوات انسانیہ میں سب سے پہلے باطل کے ان ہی انسانیت سوز معیاروں پر خطِ تنسیخ کھینچا گیا۔ اس طرح تمام نوعِ انسانی کو ایک عالمگیر برادری قرار دے کر، صرف شرفِ انسانیت کو باعثِ تکریم اور وجہِ تعظیم بتا دیا گیا جو اتباعِ قوانینِ الٰہیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس فطری تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا جس کی رُو سے انسان دو جماعتوں میں منقسم ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایک وہ جماعت جو تمام انسانوں کی محکومیت سے انکار کر کے صرف ایک خدا کی حکومت کو تسلیم کرے۔ اور دوسری وہ جماعت جو انسانوں کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کے سامنے اپنی گردن جھکا دے، خواہ وہ قوانین خود اپنے وضع کردہ ہوں یا دوسرے انسانوں کے مسلط کردہ۔ اوّل الذکر جماعت (امتِ مسلمہ) اس یک رنگی اور ہم رنگی، اشتراکِ نصب العین اور وحدتِ مقصد کی بنا پر باہمدگر بھائی بھائی۔ اور اس حقیقتِ کبریٰ سے انکار کرنے والے انسان (کافر) دوسری سوسائٹی کے افراد۔ اس لئے فرمایا کہ

ان کل مسلم اخو مسلم وان المسلمین اخوۃ۔

یاد رکھو! ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور اس طرح تم روئے زمین کے مسلمان رشتۂ اخوت میں منسلک اور مسلک مودت سے منوط ہو۔

اور یہ رشتۂ اخوت و رابطۂ مودت محض ایک نظری عقیدہ نہیں بلکہ یاد رکھو کہ

ان دمائکم واموالکم واعراضکم علیکم حرام کحرمۃ یومکم ھذا فی شھرکم ھذا۔ فی بلدکم ھذا۔ الی یوم تلقون ربکم۔

تمہارا خون اور تمہارا مال اور تمہاری آبرو قیامت تک کے لئے ایک دوسرے کے نزدیک اسی طرح محترم ہونی چاہیئے جس طرح یہ دن اس مہینہ میں اور اس شہر میں وجہِ احترام ہے۔

یاد رکھو:۔

لا ترجعوا بعدی ضلا لا یضرب بعضکم رقاب بعض وستلقون ربکم فیسئلکم عن اعمالکم۔

کہیں میرے بعد (ائتلاف و مرکزیت کی صراطِ مستقیم چھوڑ کر) تشتت و افتراق کی گمراہی نہ اختیار کر لینا کہ خود ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگ جاؤ۔ یاد رکھو! تمہیں خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا۔

یہ وحدت و یک رنگی صرف تمہارے نظام سے قائم رہ سکے گی۔ اس نظام کی بنیاد قرآن پر ہے۔ اور یہی قرآن

ہے جسے میں اپنے بعد تمہارے لئے چھوڑ جاؤں گا۔

وانی قد ترکت فیکم مالن تضلوا بعدہٗ، ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟ کتاب اللہ۔

یہ ہے تمہارے نظام کا ضابطہ، قانون۔ اور اس قانون کو نافذ کرنے والا تمہارا امیر جس کی اطاعت بمنزلہ خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے ہوگی۔

ان امرکم علیکم عبد مجدع اسود یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا لہ واطیعوا

اگر کوئی حبشی، بینی بریدہ غلام بھی تمہارا امیر ہو اور وہ تمہیں قرآن کے مطابق لے چلے تو اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرو۔

اس نظامِ دینی میں ہر رکن کو اس کی اپنی جگہ پر رکھو۔ اس کے مقام سے اسے اونچا نہ لے جاؤ۔ اس لئے کہ قوموں کی ہلاکت و بربادی اسی غلو سے ہوئی۔

ایاکم والغلو فی الدین۔ فانما اھلک قبلکم الغلو فی الدین۔

دین میں غلو مت کرو کہ تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئیں۔

پھر فرمایا کہ یاد رکھو قوموں کی تعمیر و تربیت میں آغوشِ مادر کا حصہ بڑا بنیادی ہوتا ہے۔ اس لئے اپنے نظامِ مدنیت میں عورتوں کی صحیح پوزیشن کو نظر انداز نہ کر دینا۔

فاتقوا اللہ فی النساء۔ ان لکم علیٰ نساءکم حقا ولھن علیکم حقا۔

عورتوں کے معاملہ میں (بھی) قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یاد رکھو تمہارا عورتوں پر اور عورتوں کے تم پر حقوق ہیں (ان حقوق کو نظر انداز مت کرو)۔

یہ فرما کر آپؐ نے مجمع پر ایک غائر نگاہ ڈالی۔ قریب ایک لاکھ پروانوں کا ہجوم اس شمع نبوت کے گرد تھا۔ وہ گروہِ عظیم جس کی گردنیں دنیا کی کسی طاغوتی قوت کے سامنے نہیں جھک سکتی تھیں، اپنے خدا کے حضور سر جھکائے کھڑا تھا ——— اس سعادتِ عظمیٰ کی فراوانی پر شاداں و نازاں جو انہیں مجاہدانہ سعی و عمل کے سلسلے میں بارگاہِ ربّ العزت سے اس طرح عطا ہوئی تھی، اور ان ذمہ داریوں کے بارِ گراں کے احساس سے لرزاں و ترساں جو نوعِ انسانی کی امامت و قیادت کے سلسلے پر ان پر عائد ہو رہی تھیں۔ حضورؐ نے انہیں مخاطب کر کے فرمایا کہ

انتم مسئولون عنی فما انتم قائلون۔

تم سے خدا کے ہاں میری بابت پوچھا جائے گا۔ کہو تم کیا جواب دو گے؟

لاکھوں زبانیں ایک ہی وقت پکار اٹھیں کہ ہم کہیں گے کہ آپ نے خدا کا پیغام پہنچا دیا اور اپنا فرض ادا کر دیا۔"

کتنی عظیم الشان ہے یہ شہادت جو کسی انسان کو اپنے فرائض کی تکمیل کے بعد میسّر آجائے۔ آپ نے

آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور تین بار فرمایا:۔

اَللّٰھُمَّ اشھد ـــــ اے خدا تو گواہ رہنا۔

جس شاہدِ عادل کی گواہی کی استدعا کی گئی تھی اس نے اپنی شہادت کا ان الفاظ میں اعلان کر دیا کہ

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَ رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔ (۵/۳)۔

آج میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اور (اس طرح) اپنی نعمت کا اِتمام کر دیا اور تمہارے لئے اسلام کو بطور نظامِ حیات منتخب کر دیا۔

ہزاروں آنکھیں تھیں جو اتمامِ نعمت کی اس بشارتِ عظمیٰ پر فرطِ مسرت سے عطر پاش تھیں۔ لیکن سینکڑوں آنکھیں ایسی بھی تھیں جو اپنے محبوب کی جدائی کے احساس سے شبنم فشاں تھیں، اس لئے کہ انہوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا کہ تکمیلِ دین کے بعد یہ ذاتِ گرامی دنیا سے تشریف لے جائے گی اور یہ آیۂ مقدسہ اس آنے والی ساعتِ فراق کی پیش آہنگ ہے۔[1]

خطبہ سے فارغ ہو کر حضور جانبِ منیٰ روانہ ہوئے۔ اس شاہانہ جلوس کا انداز یہ تھا کہ ایک "حبشی غلام" (حضرت بلالؓ) ناقہ کی مہار پکڑے تھے اور ایک "غلام ابن غلام" (حضرت اسامہ بن زیدؓ) شریکِ سواری، کپڑا تان کر فرقِ مبارک پر سایہ کئے تھے۔ اور اونٹنی پر ایک پالان تھا جس کی قیمت ایک روپیہ سے زائد نہ تھی۔ خدا کی طرف سے تکمیلِ دین کا اعلان ہو چکا تھا اور یہ دین اپنی عملی شکل میں خدا کی زمین پر نافذ۔ یعنی نظامِ انسانیت مشیت کے صحیح خطوط پر متشکل ہو چکا تھا۔ وہ نظام جس پر چلنے کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا تھا لیکن جس میں انسان کے خود ساختہ قوانین و دساتیر کی آمیزش نے اس کی ہیئت بدل ڈالی تھی۔ آج اس کی تمام کانٹ چھانٹ اور آلودگیاں یکسر دور ہو گئیں اور وہ نظام اُسی حالت پر آ گیا جس پر اسے خالقِ فطرت نے متعین کیا تھا۔ اس لئے آپ نے فرمایا کہ

زمانہ اپنے مرکزِ اصلی پر

ان الزمان قد استدار کھیئۃ یوم خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض۔

زمانہ پھر پھر کر آج پھر اسی نقطہ پر آ گیا جس پر اللہ نے اسے تخلیقِ ارض و سمٰوٰت کے وقت متعین کیا تھا۔

یہی مقصودِ مشیت تھا۔ یہی انسانی تگ و تاز کا منتہیٰ تھا۔ یہی اس کاروانِ رشد و ہدایت کی آخری منزل تھی جو کبھی جودی کی چوٹیوں پر ٹھہرا، اور کبھی شام کے سبزہ زاروں میں رُکا۔ کبھی نیل کی وادیوں میں گھوما، اور کبھی سینا کے پہاڑوں سے گذرا۔ کہیں یروشلم کے میدانوں میں اُترا اور پھر بطحا کے صحراؤں میں فروکش ہوا۔ یہی وہ جنت تھی، جو جنت سے نکلے ہوئے آدم کو اس کے اعمال کے بدلے میں ملنی تھی اور مل کر پھر نہ چھننی تھی، بشرطیکہ وہ اس نظام پر عمل پیرا رہتا۔

[1] اس آیت کے زمانہ نزول کے متعلق اختلاف ہے۔

اس اعلانِ عظیم کے بعد حضورؐ نے پھر مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا کہ

الاھل بلغت

کیوں؟ میں نے پیغامِ خداوندی تم تک پہنچا دیا؟

سب بول اُٹھے۔ ہاں پہنچا دیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

اللّٰھم اشھد

اے خدا تو گواہ رہنا۔

پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:۔

فلیبلغ الشاھد الغائب

جو لوگ اس وقت موجود ہیں وہ اس پیغام کو ان تک پہنچا دیں جو موجود نہیں ہیں۔

مدینہ کو واپسی

اور اس طرح اس پیغامِ خداوندی کی وسعتوں کو ابدیت سے ہم کنار کر دیا۔

تکمیلِ دین کے اس فریضہ مہمہ سے فارغ ہو کر یہ کاروانِ سعادت و رحمت، مراجعت فرمائے مدینہ ہوا۔ نواحِ مدینہ پر نگاہ پڑی تو فرمایا:۔

اللّٰہ اکبر۔ لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہٗ لا شریک لہ۔ لہ الملک و لہ الحمد وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔ آئبون۔ تائبون۔ عابدون۔ ساجدون۔ لربنا حامدون صدق اللّٰہ وعدہ ونصر عبدہ وھزم الاحزاب وحدہٗ۔

کبریائی و جبروت سب خدا کے لئے ہے۔ اس کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے سامنے جھکا جائے۔ وحدہ لاشریک۔ حکومت صرف اسی کے لئے ہے اور ستائش و زیبائش کی مرکز اسی کی ذات۔ اس نے ہر شے کے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں جو اٹل ہیں۔ لوٹے آرہے ہیں اس کے بندے، ساری دنیا سے منہ موڑ کر صرف اسی کے آستانہ کی طرف رُخ کئے ہوئے (تائبون) تمام طاغوتی قوتوں کی سرکشیوں کو پامال کر کے صرف اسی کی محکومیت کا قلادہ زیب گلو کئے ہوئے (عابدون) ساری دنیا کے سامنے غیورانہ اٹھنے والی پیشانیاں اس کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز (ساجدون) تمام دنیا سے خراجِ تحسین وصول کرنے والے اس مرجع حسن و خوبی کی حمد و ستائش میں زمزمہ بار۔ اس لئے کہ اس نے اپنا وعدہ سچا کیا۔ اپنے بندے کی مدد کی اور تمام مخالف قوتوں کو شکست دی۔ آرہے ہیں خدا کے بندے لوٹ کر۔

استقبالِ خسروانہ

نظامِ انسانیت کی امامتِ کبریٰ کا یہ مرکزِ اوّلین، تکمیلِ دین و اتمامِ نعمت کی ہزار جنتیں اپنے جلو میں لئے بہ کمالِ حسن و رعنائی واپس آرہا ہے۔

اور مدینہ کی گلیوں کا ذرّہ ذرّہ اُبھر کر کہہ رہا ہے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا! اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

اے زمین از بارگاہت ارجمند　　آسماں از بوسہ بامت بلند
از تو بالا پایۂ ایں کائنات　　فقر تو سرمایۂ ایں کائنات!
سجدہ ہائے طفلک و برناؤ پیر!
از جبین وچشم ہائے ما بگیر!

شکانِ ارضی، حمد و ستائش میں اس طرح نغمہ سنج و زمزمہ بار تھے اور آسمان سے خدا اور اس کے فرشتے اس تکمیل کار اور حسنِ مآب پر یہ کہہ کر تبریک و تہنیت کے پھول برسا رہے تھے کہ

إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ يُصَلُّونَ عَلَى النَّبِيِّ ۚ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا ﴿۳۳/۵۶﴾

کس قدر مبارک ہے وہ آغاز جس کا انجام اس قدر حسین ہو۔ اور کیسی پُر بہار ہے وہ شاہراہِ زندگی جو اس آغاز و انجام کے نقاط سے مربوط ہو۔

فَالْحَمْدُ لِلَّهِ عَلَى ذَٰلِكَ حَمْدًا كَثِيرًا۔

("معراجِ انسانیت" از پرویزؔ)

طلوعِ اسلام

خطبۂ جلیلہ کا متن اس امر کی شہادت پیش کرتا ہے کہ اسے حضور نبی اکرمؐ کا ارشادِ گرامی تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود، اس میں بھی ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے۔

حضورؐ نے یہ خطبہ، حج کی تقریب پر، عرفات کے میدان میں ارشاد فرمایا، جہاں کہا جاتا ہے کہ ایک لاکھ بلکہ اس سے بھی زیادہ سامعین موجود تھے۔ انہوں نے اسے جس انہماک اور توجہ سے سنا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ اس میں اُمّت کی راہ نمائی کے لئے ایک بنیادی اصول بیان کیا گیا ہے۔ یعنی حضورؐ نے فرمایا کہ

میں تم میں ایک ایسی چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر تم نے اسے مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز کیا ہے؟　　کتاب اللہ　　(صحاح)

لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ بعض روایات میں، اس کے ساتھ کچھ اور بھی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ ہیں۔

کتاب اللہ اور سنتِ رسول اللہؐ۔　　(حیاتِ محمدؐ۔ محمد حسین ہیکل مصری۔ صفحہ ۴۹)

اور طبری میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم میں دو ایسی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر تم نے انہیں مضبوطی سے تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ اور وہ دو چیزیں ہیں۔

کتاب اللہ اور عترتی (میری اولاد)　　(تاریخ طبری۔ جلد اوّل۔ حجۃ الوداع)

آپ غور فرمایئے کہ اس قسم کے عظیم اجتماع میں، ایسے بلیغ اعلامیہ کے دو الفاظ کے آگے منتقل ہوتے ہیں اختلاف کا یہ عالم ہے تو تئیس سال کے عرصہ میں، جلوت اور خلوت میں حضورؐ کے ارشاد فرمودہ کلمات، دو اڑھائی سو سال بعد مرتب ہونے میں اختلافات کی کیا صورت نہ ہوگی؟

مطالب الفرقان - جلد چہارم، چھپ گئی

للہ الحمد کہ، حالات کی اس قدر نامساعدت کے باوجود، مطالب الفرقان کی چوتھی جلد بھی چھپ گئی ہے۔ اس کی پہلی تین جلدیں صرف سورۂ بقرہ کو محیط تھیں۔ یہ جلد سورۂ آلِ عمران۔ سورۃ النساء اور سورۃ المائدہ پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے سب سے ضخیم تیسری جلد تھی جس کی ضخامت قریب ساڑھے پانچ سو صفحات تھی۔ چوتھی جلد قریب ساڑھے چھ سو صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ حجم کی زیادتی کی وجہ سے پہلے خیال تھا کہ سورۃ المائدہ کو اس میں سے حذف کر دیا جائے لیکن قارئین کے بے پناہ اشتیاق کے پیشِ نظر مناسب نہ سمجھا گیا کہ انہیں مزید عرصہ کے لئے اس کے انتظار میں رکھا جائے۔ اس جلد کے نمایاں موضوعات یوں سامنے آتے ہیں۔

- آیاتِ محکمات و متشابہات۔
- حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ کے احوال و کوائف۔
- حضرت مریمؑ کی انقلاب انگیز زندگی۔
- حضرت عیسےٰؑ کی داستانِ حیات۔
- بن باپ کی پیدائش کا عقیدہ۔
- مذہبی پیشوائیت کی خود ساختہ خدائی کے خلاف سرکشی۔
- رومن شاہنشاہیت کے خلاف بغاوت۔
- واقعہ صلیب کی تفصیلی سرگزشت۔
- معجزات کی حقیقت۔
- وفات و نزولِ مسیح کی بحث۔
- تحقیقاتِ جدیدہ کی روشنی میں بصیرت افروز انکشافات۔
- اسلامی نظام۔
- سنت اور حدیث کی صحیح پوزیشن۔
- اطاعتِ خدا و رسول کا قرآنی مفہوم۔
- ترکہ اور وراثت کے احکام اور تقسیم۔
- یتیم پوتے کی وراثت۔
- حدود (جرائم کی قرآنی سزائیں)۔
- قطعِ ید وغیرہ۔

ان چند ایک عنوانات سے کتاب کے مندرجات کی اہمیت کا اندازہ لگ سکتا ہے۔ اسے ادارہ طلوعِ اسلام کے اشاعتی معیار کے مطابق، دلکش اور پائیدار انداز سے طبع کیا گیا ہے۔ عام کتابوں کے مقابلہ میں ضخامت کے قریب دگنا ہو جانے کی وجہ سے قیمت -/۹۰ روپے (ڈاک خرچ -/۸ روپے) مقرر کی گئی ہے۔

ملنے کے پتے:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی، گلبرگ ۲- لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور

ہماری تاریخ

(ہم نے جب روایات (احادیث) کے متعلق لکھا کہ وہ کس طرح جمع اور مرتب کی گئیں اور دین کا ذریعہ علم ہونے کی جہت سے وہ کس قدر غیر یقینی اور ظنّی ہیں، تو بعض احباب نے ہمیں لکھا کہ صدرِ اوّل (عہدِ نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ) میں اسلامی نظام عملاً قائم ہوا تھا، اس لئے اس دور کی تاریخ تو یقینی ذریعہ علم ہو سکتی ہے۔ اس سے ہمیں اس نظام کی عملی تفاصیل معلوم ہو سکتی ہیں۔ ان سے کیوں نہ راہ نمائی حاصل کی جائے۔ اس سے یہ حقیقت سامنے آئی کہ جس طرح ہماری قوم کے دانشوروں نے حدیث سے متعلق لٹریچر کا مطالعہ نہیں کیا، اسی طرح انہیں ہماری تاریخ کے متعلق بھی صحیح معلومات حاصل نہیں۔ ذیل کے مقالہ سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ہماری تاریخ، اسلام کے صدرِ اوّل کا کس قسم کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ واضح رہے کہ جس طرح احادیث میں جامعہ امام بخاریؒ کو اوّلیت حاصل ہے اسی طرح تاریخ میں اوّلیت امام ابن جریر طبریؒ کو حاصل ہے۔ اس مقالہ کے مندرجات اکثر و بیشتر، بخاری اور طبری پر مشتمل ہیں۔ ان کا غور سے مطالعہ فرمائیے۔)

(۱)

تاریخ بھی عجیب دو دھاری تلوار ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس اس کی صحیح تاریخ موجود ہے تو وہ قوم اپنے ماضی کے تجربات کے آئینہ میں اپنے حال کو درخشندہ اور مستقبل کو تابندہ بنا سکتی ہے۔ لیکن اگر اس کی تاریخ غلط ہے تو وہ غلط فہمیوں اور خوش عقیدگیوں کی ایسی اندوہناک تاریکیوں میں گھری رہتی ہے جن سے اس کا نکلنا محال ہو جاتا ہے۔ ہمارے ساتھ یہی ہوا ہے۔ ہمارے زوال کے اسباب میں بنیادی عنصر ہماری غلط تاریخ ہے۔

ہمارے پاس خدا کی کتاب ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے (اور علیٰ وجہ البصیرت اور مبنی علی الحقیقت ایمان) کہ وہ ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے اور ہر زمانے میں ہماری صحیح راہ نمائی کرنے کے لئے مکمل اور کافی ہے۔ اگر ہم اس کا اتباع کریں تو ہمیں اقوامِ عالم کی امامت مل سکتی ہے۔ بظاہر ہے کہ قرآن کی راہ نمائی ہمارے لئے اسی صورت میں نفع بخش ہو سکتی ہے جب ہم اسے سمجھیں لیکن

قرآن فہمی کے راستہ میں روک

قرآن کو صحیح طور پر سمجھنے کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہماری غلط تاریخ ہے۔ یہ بات شاید آپ کے نزدیک تعجب انگیز اور حیرت خیز ہو۔ لیکن جب حقائق آپ کے سامنے آئیں گے تو آپ اس کی صداقت کو بلا تامل تسلیم

کریں گے۔ قبل اس کے کہ ہم اس کی کچھ مثالیں آپ کے سامنے پیش کریں، تمہیداً یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ تاریخ کس طرح قرآن کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ مثلاً قرآنِ کریم جس معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اس کے افراد (جماعتِ مومنین) کی خصوصیات میں یہ بھی بتاتا ہے کہ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (۲/۳) جو کچھ انہیں خدا کی طرف سے سامانِ زیست ملتا ہے وہ اُسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اس کھلا رکھنے یا دوسروں کو دے دینے کی تصریح ان الفاظ سے کردی کہ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ...... (۲/۲۱۹) اے رسول! جماعتِ مومنین کے افراد تجھ سے دریافت کرتے ہیں کہ ہم اپنے مال و دولت میں سے کس قدر دوسروں کو دیں؟ جواب میں کہا گیا۔ قُلِ الْعَفْوَ .... (۲/۲۱۹) ان سے کہدو کہ جس قدر تمہاری ضرورت سے زائد ہے سب کا سب۔ ان آیات سے واضح ہے کہ قرآنی معاشرہ میں افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی میں سے صرف اسی قدر اپنے پاس رکھ سکتے ہیں جو ان کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ اس سے زائد قرآنی نظام (یا اسلامی مملکت) میں چلا جائے گا جو اسے نوعِ انسان کی ربوبیت (پرورش) کے لئے صرف کرے گا۔ ان آیات کا مفہوم سمجھنے میں نہ کوئی دقّت پیش آتی ہے نہ دشواری۔ نہ ان میں کوئی اشکال ہے نہ اغلاق۔ لیکن آپ جب یہ آیات کسی کے سامنے پیش کریں تو وہ جواب میں کہہ دیتا ہے کہ فلاں صحابیؓ کے پاس لاکھوں درہم و دینار تھے۔ فلاں کے پاس چاندی اور سونے کے ڈھیر لگے رہتے تھے۔ فلاں کے پاس کارواں در کارواں سامانِ تجارت رہتا تھا۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زائد دولت اپنے پاس رکھ سکتا تو ان حضرات کے پاس اس قدر دولت کیوں جمع رہتی تھی۔ اس کے بعد سلسلۂ کلام کچھ اس انداز کا ہوتا ہے۔

وہ صاحب:۔ فرمائیے! صحابہؓ کبار قرآن کو صحیح طور پر سمجھتے تھے یا آپ بہتر سمجھتے ہیں؟

آپ:۔ میں تو کبھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں صحابہ کبارؓ سے زیادہ قرآن سمجھتا ہوں۔

وہ صاحب:۔ کیا صحابہ کبارؓ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرتے تھے یا ان کا عمل اس کے خلاف تھا؟

آپ:۔ معاذ اللہ! میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ ان کا عمل قرآن کے خلاف تھا۔ ان کی زندگی بالکل قرآن کے مطابق تھی۔

وہ صاحب:۔ جب ان کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اور ان کے پاس اس قدر مال و دولت جمع رہتا تھا تو پھر آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے زائد از ضرورت مال، افراد کے پاس نہیں رہ سکتا۔

اس منطق کا آپ کے پاس کوئی جواب نہیں ہوتا۔ سننے والے بھی فریقِ مقابل کے ساتھ متفق ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سر ہلا کر کہہ دیتا ہے کہ بات بالکل ٹھیک ہے۔ جب صحابہ کبارؓ کے پاس اس قدر مال و دولت تھا تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں دولت جمع کرنا ممنوع ہے؟ کیا (معاذ اللہ) صحابہؓ کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا تھا؟

آپ نے دیکھا کہ تاریخ کس طرح قرآن کے راستے میں آکر کھڑی ہو گئی؛ آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ ہمارا مروّجہ اسلام تاریخ کا مرتب کردہ ہے اور اس کا بیشتر حصہ قرآن کے خلاف ہے۔ مروّجہ اسلام کی کسی شق کے متعلق آپ سند مانگیئے۔ وہ سند تاریخ سے پیش جائے گی۔ اگر آپ کہیں کہ اس کی سند قرآن سے پیش کیجئے تو جواب میں کہہ دیا جائے گا کہ

نازک دلیل

ہم رسول اللہؐ کی سیرتِ طیبہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سے اس کی سند پیش کر رہے ہیں۔ اس سے بڑھ کر دین میں سند اور کیا ہو سکتی ہے؟ قرآن کے سمجھنے کے لئے سیرتِ رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کی حیاتِ مقدسہ کا سامنے رکھنا لابُدّ ہے۔ اس کے بغیر قرآن سمجھ میں نہیں آسکتا۔

یہ جواب اس قدر مسکت ہے کہ اس کے بعد آپ کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ تاریخ، دین کی سند بن گئی ہے اور قرآنِ کریم ایصالِ ثواب کے لئے رہ گیا ہے۔ اگر کبھی ایسا ہو کہ تاریخ کے کسی واقعہ کی تائید قرآن کی آیت سے مل جائے تو اس وقت قرآن کو بڑھا چڑھا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ لیکن جب تاریخ اور قرآن میں تضاد ہو تو سند تاریخ کو حاصل ہو گی۔ قرآن کو نہیں۔

تاریخ کی صحیح پوزیشن

جب تک ہم قرآن اور تاریخ کی صحیح صحیح پوزیشن کو نہیں سمجھتے اور انہیں اپنے اپنے مقام پر نہیں رکھتے، دین اپنی حقیقی شکل میں ہمارے سامنے نہیں آسکتا۔

قرآن کا ایک ایک لفظ اپنی اصل شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ اس میں شبہ اور شک کی کوئی گنجائش نہیں۔ جہاں تک تاریخ کا تعلق ہے (خواہ وہ کتب احادیث میں ہو اور خواہ کتب سیر و آثار میں) اس کی پوزیشن یہ ہے کہ ان میں سے کوئی کتاب نہ رسول اللہؐ نے مدوّن کرا کر اُمّت کو دی۔ نہ خلفائے راشدینؓ نے انہیں مرتب کیا۔ نہ ہی ان میں سے کوئی کتاب صحابہؓ کے زمانے میں مرتب ہوئی۔ حدیث کا وہ مجموعہ جسے اصحّ الکتب بعد کتاب اللہ کہا جاتا ہے۔ (یعنی بخاری شریف) وہ رسول اللہؐ کی وفات کے قریب اڑھائی سو سال بعد مرتب ہوا۔ اور تاریخ کی سب سے پہلی جامع کتاب جسے ام التواریخ کہا جاتا ہے (یعنی تاریخ طبری) رسول اللہؐ کی وفات کے قریب تین سو سال بعد لکھی گئی۔ اس وقت بھی کوئی تحریری ریکارڈ موجود نہیں تھا جس سے ان کتب احادیث و تاریخ کو مرتب کیا گیا ہو۔ یہ یکسر ان باتوں پر مشتمل تھیں جو انہوں نے اپنے ہم عصروں کی زبانی سُنیں۔ یہ ہے ہماری تاریخ کی اوّلیں کتابوں کی پوزیشن جن سے سیرتِ رسول اللہؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی سامنے آتی ہے۔ (واضح رہے کہ نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کا بیشتر حصہ اور صحابہ کبارؓ کی خصوصیاتِ کبریٰ خود قرآنِ کریم میں بھی مذکور ہیں۔ لیکن اس وقت ہم سیرت و آثار کے اس حصّے کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں جو کتبِ احادیث و سیر وغیرہ میں موجود ہے)۔

قرآن اور تاریخ کی جو پوزیشن اوپر بیان کی گئی ہے۔ اس سے ہر صاحبِ بصیرت اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ جب بھی قرآن کے کسی بیان اور عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ کے کسی واقعہ میں تضاد نظر آئے تو قرآن کے بیان کو صحیح اور تاریخ کے واقعہ کو غلط قرار دینا چاہیئے۔ یہ ایک ایسی حقیقتِ باہرہ ہے جس کے لئے

قرآن اور تاریخ کا باہمی تعلق

کسی دلیل و شہادت کی ضرورت نہیں۔ یہ اپنی دلیل آپ ہے۔ اب رہے تاریخ کے وہ بیانات جن کے متعلق قرآن خاموش ہے تو ایسی صورت میں بھی ہمارے لئے اصولِ کار واضح ہے۔ یعنی :-

(۱) ہمارا ایمان ہے (اور قرآن اس کی شہادت دیتا ہے) کہ نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کی تعلیم کے مطابق تھی۔

(۲) لہٰذا اگر تاریخ میں نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کے متعلق کوئی ایسی بات ملتی ہے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔

اس طرح دین کا صحیح تصور بھی قائم ہو جائے گا اور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی سیرت پاکیزہ اور حقیقی شکل میں ہمارے سامنے آجائے گی۔

جو کچھ ہم نے (نظری طور پر) اوپر کہا ہے وہ واضح انداز میں سمجھ میں نہیں آسکتا۔ جب تک تاریخ سے اس کی کوئی مثال نہ پیش کی جائے۔ ہم عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین) کی

ایک مثال

تاریخ سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں (اس کے لئے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے) اس لئے ہم اس ضمن میں صرف ایک واقعہ پیش کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ یہ وہ واقعہ ہے جو اُس وقت پیش آیا جب نبی اکرمؐ نے سفرِ آخرت اختیار فرمایا۔ اور ہنوز آپؐ کے جسمِ طیب کو سپردِ خاک بھی نہیں کیا گیا۔ اور اس کا تعلق صحابہ کبارؓ کی اُس پوری جماعت سے ہے جو اُس وقت مدینہ میں موجود تھی۔

پہلے اس سلسلہ میں، قرآن کی تعلیم کو سامنے لائیے۔ قرآن کی بنیادی اور اور غیر متبدل اصول یہ

قرآن کے غیر متبدّل اُصول

ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ..... (۱۷/۷۰) ہم نے ہر انسانی بچہ کو، محض اس کے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ یعنی اس میں حسب نسب، امیر، غریب، رنگ اور وطن۔ مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہیں۔

(۲) واجب التکریم ہر انسانی بچہ ہے۔ اب رہا مختلف افراد کے مدارج کا تعین، سو اس کے لئے اصول یہ ہے کہ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا..... (۴۶/۱۹) ہر ایک کا درجہ اس کے کاموں کے مطابق متعین کیا جائے گا۔ بالفاظِ دیگر مدارج کا تعین، جو ہر ذاتی اور اعمال کی بنا پر ہوگا۔ اس میں بھی خاندان، قبیلہ، ذات، گوت، رشتہ داری، امارت، غرضیکہ کسی اضافی نسبت کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(۳) اسی اصول کے مطابق، امت میں سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوگا جو قوانینِ خداوندی کا سب سے زیادہ پابند ہوگا۔ جس کی سیرت و کردار سب سے زیادہ قرآن کے مطابق ہوں گے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ..... (۴۹/۱۳)

ان غیر متبدل اصولوں کی رُو سے قرآن نے رنگ۔ نسل۔ خون۔ قبیلہ۔ ذات وغیرہ کے تمام امتیازات

ختم کر دیئے۔ اور عزت و تکریم کا صرف ایک معیار باقی رکھا۔ یعنی جوہرِ ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار۔

اُمت کا فریضہ

اب آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ نے قرآنی اصولوں کے مطابق ایک معاشرہ متشکل فرمایا۔ ایک مملکت قائم کی۔ جس کا مقصد "امر بالمعروف و نہی عن المنکر" تھا۔ چونکہ اس نظام کو نبی اکرمؐ کی زندگی تک ہی نہیں رہنا تھا۔ اسے مسلسل آگے چلنا تھا کیونکہ اسی کا نام دین تھا۔ اس لئے اس مقصد کے لئے ایک اُمت تیار کی گئی۔ اس اُمت کے متعلق قرآن میں ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ...... (۳/۱۰۹) تم بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضۂ حیات امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

یہی وہ اُمت تھی جسے وراثتِ کتاب کے لئے منتخب کیا گیا تھا۔ قرآن میں ہے: ثُمَّ أَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا ...... (۳۵/۳۲) پھر ہم نے ان لوگوں کو اس کتاب کا وارث بنایا جنہیں اس مقصدِ جلیل کے لئے اپنے بندوں میں سے چنا تھا۔ یہ اُمت (اس زمانے میں) مہاجرین اور انصار پر مشتمل تھی جس کے پکے اور سچے ہونے کا سرٹیفکیٹ خود اللہ تعالٰے نے عطا فرمایا تھا۔ سورۂ انفال میں ہے:۔

صحابہؓ کے فضائل

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ط لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ (۸/۷۴)

اور جو ایمان لائے۔ اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اور جنہوں نے (انہیں) پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ یہ سب سچے اور پکے حقیقی مومن ہیں۔ ان کے لئے ہر قسم کی حفاظت اور عزت کا رزق ہے۔

دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ تعالٰے نے ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی تھی۔ اور یہ وہ نعمتِ کبریٰ تھی جو ساری دنیا کی دولت خرچ کرنے پر بھی نہیں مل سکتی تھی (۸/۶۳) سورۂ توبہ میں ان کے متعلق ہے: اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۹/۸۸) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لئے ہر قسم کی بھلائیاں ہیں اور یہی ہیں جو کامیاب و کامران ہیں۔ سورۂ فتح میں خالقِ کائنات نے ان "پکے اور سچے مومنین" کی جس والہانہ انداز میں توصیف و تعریف کی ہے وہ ان حضرات کی بلندیٔ مقام کی زندہ شہادت ہے۔ دیکھئے! کہنے والے نے کس طرح جھوم جھوم کر کہا ہے:۔

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ط ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ط وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوْا

الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ (۴۸/۲۹)

اس آیۂ جلیلہ کا مفہوم یہ ہے:-

محمدؐ رسول اللہ اور ان کے رفقاء کی جماعت بھی کیا عجیب جماعت ہے۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ مخالفین کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت ہیں اور آپس میں بڑے نرم دل اور ہمدرد تو انہیں دیکھنا ہے کہ وہ کس طرح ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے لئے جھک جاتے اور قوانینِ خداوندی کے سامنے پیکرِ تسلیم و رضا بن جاتے ہیں۔ لیکن وہ راہبوں کی جماعت نہیں وہ خدا کے قانون کے مطابق سامانِ زیست کی طلب و جستجو میں بھی مصروفِ عمل رہتے اور زندگی کے ہر معاملہ میں قوانینِ الٰہیہ سے ہم رنگ و ہم آہنگ رہتے ہوئے اپنے اندر صفاتِ خداوندی منعکس کرتے ہیں۔ ان کے اندر صفاتِ خداوندی کی نمود سے سکون و طمانیت کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہوتے ہیں۔ ان کے یہ خصائص تورات میں بھی مذکور تھے اور انجیل میں بھی۔

انہوں نے جس طرح بتدریج اس نظامِ خداوندی کو قائم کیا ہے۔ اس کی مثال یوں سمجھو جیسے عمدہ بیج سے شگوفہ نکلتا ہے تو پہلی کونپل بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ پھر وہ مضبوط ہوتی چلی جاتی ہے۔ پھر جب اس کے خوشوں میں دانے پڑنے کا وقت آتا ہے تو وہ خود اپنی ناموں پر محکم اور استوار طریق سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ کاشتکار جب اپنی محنت کو یوں ثمربار ہوتے دیکھتا ہے تو وجد و مسرت سے جھوم اٹھتا ہے۔ لیکن یہی چیز اس کے دشمنوں کے سینے پر سانپ بن کر لوٹنے کا موجب بن جاتی ہے۔

اس طرح اللہ ہر اس جماعت سے جو اس کے نظام کے اَن دیکھے نتائج پر یقین رکھ کر صالح بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو، اس کا وعدہ کرتا ہے کہ ان کی کوششوں کا نتھا سا بیج تمام خطرات سے محفوظ رہے گا۔ اور ان کی کھیتی بہترین ثمرات کی حامل ہو گی۔

یہ تھی وہ جماعت، جس نے رسول اللہؐ کے مقدس ہاتھوں تربیت پائی تھی اور جس نے حضورؐ کے بعد قرآنی نظام کو آگے چلانا تھا۔ اس مقصد کے لئے ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ..... (۴۲/۳۸) وہ اپنے معاملات باہمی مشورہ سے طے کریں۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ

(۱) قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ عزت و تکریم کا معیار ذاتی جوہر اور حسنِ عمل ہے۔ نہ کہ حسب و نسب اور رشتہ داری کے تعلقات۔

(۲) صحابہ کبارؓ پکے اور سچے مومن تھے۔ ان کی سیرت بہت بلند اور کردار بڑا پاکیزہ تھا۔ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کی محبت پیوست تھی۔

(۳) قرآنی نظام کو قائم رکھنا اور آگے چلانا امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس کے لئے وہ باہمی مشورہ سے

اپنے میں سے بہترین فرد کو (جو معیارِ خداوندی پر پورا اُترے) منتخب کر کے، رسُول کا جانشین (یعنی مملکت کا سربراہ) بنائیں گے۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہتے ہیں۔

اُمّت کے لئے قرآن کے ان اصولوں پر عمل کرنے کا پہلا موقعہ، رسُول اللہ کی وفات کے فوری بعد پیدا ہو گیا۔ یعنی خلیفہ کا انتخاب۔

یہ تھی قرآنِ کریم کی تعلیم اور قرآن کی رُو سے صحابہ کبارؓ (جماعتِ انصار و مہاجرین) کی خصوصیاتِ کبریٰ۔ اب دیکھئے کہ تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔

(٥)

خلافت کے متعلق حضرتِ عباسؓ اور حضرت علیؓ کے خیالات

بخاری (باب وفات النبیؐ) میں حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی روایت سے حسبِ ذیل واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس بیماری میں جس میں آپ نے وفات پائی علی ابن طالبؓ رسول اللہ صلعم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابوالحسن! رسول اللہ صلعم نے کس حالت میں صبح فرمائی؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ تو عباسؓ بن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلعم کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو رسول اللہ صلعم کے پاس چلیں اور آپ سے دریافت کریں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہو گی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا۔ اور اگر ہمارے سوا دوسروں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ، اپنے جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے (اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہو گا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ صلعم سے پوچھ لیا اور آپؐ نے انکار کر دیا تو آپ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ صلعم سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔　　(صحیح بخاری۔ باب وفات النبیؐ)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ ابھی حضورؐ کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ حضورؐ کے چچا حضرت عباسؓ اور چچازاد بھائی اور داماد حضرت علیؓ کے دل میں خلافت کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ لیکن حضرت عباسؓ کا اندازہ کچھ اور تھا۔ اس لئے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے (خلافتِ حضرت علیؓ کے متعلق) توثیق کرا لینا چاہتے تھے۔ اس پر حضرت علیؓ نے جو جواب دیا وہ قابلِ غور ہے۔ یعنی اگر ہم نے رسول اللہؐ سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو پھر ہمارے لئے کوئی گنجائش

؎ بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

(CHANCE) نہیں رہے گا۔

شیعہ حضرات کے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ جس طرح نبوت خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی ہے اور اس میں انتخاب اور مشورہ کا کوئی سوال نہیں، اسی طرح خلافت (امامت) بھی خدا کی طرف سے موہبت ہے۔ اس میں انتخاب وغیرہ کا کوئی سوال نہیں۔ امام، خدا کی طرف سے منصوص اور مامور ہوتا ہے۔ یہ امامت حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد، خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہے۔

لیکن سُنّی حضرات کا یہ عقیدہ نہیں۔ ان کے نزدیک، خلیفہ اُمّت کے مشورہ سے منتخب ہوتا ہے۔ نہ ہی خلافت کوئی جائداد ہے، جو متوفی کے بعد اس کے رشتہ داروں کو بطور ترکہ مل سکتی ہے۔ یہ تصوّر کہ حکومت باپ کے بعد بیٹے کو ورثہ میں ملتی ہے، ملوکیت ہے جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا۔

اگر اس روایت کو صحیح مانا جائے تو.....

جو روایت اوپر درج کی گئی ہے وہ شیعہ حضرات کی نہیں، سُنیوں کی حدیث کی سب سے معتبر کتاب بخاری میں درج ہے۔ اب آپ غور فرمایئے کہ اگر اس حدیث کو صحیح مان لیا جائے تو رسول اللہؐ کے قریب ترین صحابہؓ (حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ) کے متعلق کیا تصوّر قائم ہوتا ہے؟ یہ تصوّر کہ وہ (معاذ اللہ) اسلام کے ابتدائی اور بنیادی اُصول کو بھی نہیں سمجھ سکے تھے کہ خلافت بطور وراثت یا استحقاق نہیں ملتی۔ یہ معاملہ اُمّت کے باہمی مشورہ سے طے ہوتا ہے، پھر جو جواب حضرت علیؓ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اس سے اُن کی سیرت و کردار پر جو زد پڑتی ہے وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

(۰)

اب آگے بڑھیئے۔ نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ چونکہ خلافت (جانشینیٔ رسولؐ) کا معاملہ اُمّت کے باہمی مشورہ سے طے ہونا تھا۔ اس لئے حضورؐ نے اس کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی تاکہ اُمّت کی آزادیٔ رائے پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ ہو جائے۔ چونکہ یہ معاملہ بہت اہم تھا ——— مرکزِ ملت کے بغیر دین کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا ——— اس لئے ایسا نظر آتا ہے کہ اُمّت نے حضورؐ کی تجہیز و تکفین سے بھی پہلے اسے طے کر لینا ضروری سمجھا۔

سقیفہ بنی ساعدہ کا اجتماع

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا اجتماع ہوا جس حضرت سعد بن عبادہؓ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک مہاجرین میں سے۔ اس وقت مہاجرین (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں پہنچ گئے۔ اس اجتماع کی جو روئداد تاریخ میں بیان ہوئی ہے وہ قابلِ غور ہے۔ کہا گیا ہے کہ (انصار میں سے) حضرت حباب بن منذرؓ نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی:-

اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو، کیونکہ لوگ تمہارے مطیع رہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے۔ تم اہلِ عزت و

حضرت حبابؓ کی تقریر

ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کر کے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے ہو اور ایک ان میں سے۔"

(محمد حسین ہیکل کی کتاب۔ "ابوبکرؓ صدیق اکبر" صفحہ ۱۰۷)[1]

آپ نے غور فرمایا۔ ہماری تاریخ کا یہ بیان اُن انصار (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) کے متعلق ہے جن کے مہاجرین کے ساتھ فدائیانہ تعلقات اور بے لوث ایثار کی شہادت خود اللہ تعالےٰ نے دی ہے۔ (تاریخ کے بیان کے مطابق) اُن کی طرف سے اِن جذبات کا اظہار اس وقت ہو رہا ہے۔ جب نبی اکرمؐ کی نعش مبارک بھی ہنوز آنکھوں کے سامنے ہے۔

یہ تو رہا انصار کے متعلق۔ اب مہاجرین کی بابت سنیئے (تاریخ بتاتی ہے کہ) اس کے جواب میں حضرت عمرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

حضرت عمرؓ کی تقریر

ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں! اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہؐ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائلِ ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار۔ گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لئے تیار ہو۔

(ابوبکر صدیقؓ از ہیکل۔ صفحہ ۱۰۸)

اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے انصار سے کہا:۔

اے انصار!۔۔۔ تم ہمت سے کام لو اور عمرؓ اور اس کے ساتھیوں کی بات نہ سنو! اگر تم نے اس وقت کمزوری دکھائی تو یہ سلطنت میں سے تمہارا حصہ غصب کر لیں گے۔ اگر یہ تمہاری مخالفت کریں تو انہیں یہاں سے جلاوطن کر دو اور سلطنت پر خود قابض ہو جاؤ۔ کیونکہ اللہ کی قسم! تمہیں اس کے سب سے زیادہ حقدار ہو۔ تمہاری ہی تلواروں کی بدولت اسلام کو شان و شوکت نصیب ہوئی ہے اس لئے اس کی قدر و منزلت کا موجب تمہیں ہو۔ تمہیں اسلام کو پناہ دینے

---

[1] یہ تمام واقعات طبری کی تاریخ میں مذکور ہیں۔

والے اور اس کی پشت پناہ ہو۔ اور اگر تم چاہو تو اسے اس کی شان و شوکت سے محروم بھی کر سکتے ہو۔ (ایضاً۔ ص ۱۰۹-۱۰۸)

اندازِ گفتگو

حضرت عمرؓ نے یہ فقرہ سنا تو کہا:۔
اگر تم نے اس قسم کی کوشش کی تو اللہ تمہیں ہلاک کر ڈالے گا۔ (ایضاً ص ۱۰۹)
اس کے جواب میں حضرت حبابؓ نے کہا:۔
ہمیں نہیں اللہ تمہیں ہلاک کرے گا۔ (ایضاً۔ ص ۱۰۹)

یہ ہے ہماری تاریخ کے مطابق ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات کا نقشہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ یہ سرٹیفکیٹ عطا فرماتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ..... (۴۸/۲۹) وہ کفار کے مقابلہ بڑے سخت اور آپس میں بڑے ہمدرد تھے۔ وہ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ..... (۸/۶۳) ان کے دلوں میں خدا نے باہمی محبت اور اُلفت ڈال دی۔ وہ محبت اور اُلفت جو دنیا بھر کی دولت دے کر بھی خریدی نہیں جا سکتی۔ (۸/۶۳)۔ ان صحابہؓ کے باہمی تعلقات اور اخلاق کے متعلق ہماری تاریخ یہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

حضرت عمرؓ کی جو تقریر (تاریخ کے بیان کے مطابق) اوپر درج کی گئی ہے اس میں انہوں نے اپنے (یعنی مہاجرین کے) حقِ خلافت کے متعلق یہ دلیل دی ہے کہ

رسول اللہؐ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں ہم سے کون جھگڑ سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جاں نثار اور اہلِ عشیرہ (اہل خاندان) ہیں۔

یہ دلیل قابلِ غور ہے۔ اس سے بیشتر ہم دیکھ چکے ہیں کہ تاریخ ہمیں حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے متعلق یہ باور کرانا چاہتی ہے کہ ان کے نزدیک خلافت حضورؐ کے قرابت داروں کو ورثہ میں ملنی چاہیئے تھی۔ اب حضرت عمرؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ انہوں نے بھی استحقاقِ خلافت کے لئے یہی دلیل دی کہ ہم رسول اللہؐ کے اہلِ خاندان ہیں۔ غور کیجئے کہ اس سے ہماری تاریخ ہمیں کہاں لے جانا چاہتی ہے۔

لیکن تاریخ ہمیں تک نہیں رہتی۔ وہ ایک قدم آگے بڑھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ جب معاملہ زیادہ نزاکت اختیار کر گیا تو حضرت ابوبکرؓ اٹھے اور آپ نے فرمایا کہ اس باب میں انصار کا دعویٰ یکسر بے بنیاد ہے۔ رسول اللہؐ

الائمۃ من قریش

نے فیصلہ کر دیا ہوا ہے کہ الائمہ من قریش "خلافت قریش میں رہے گی"۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لئے گئے۔

یہ حدیث، متفق علیہ طور پر صحیح مانی جاتی ہے۔ لیکن آپ ذرا اس کی گہرائی میں جائیے اور سوچئے کہ یہ کبھی رسول اللہؐ کا ارشاد ہو سکتا ہے؟ قرآن مسلسل و متواتر نسل اور خون کے امتیازات مٹا کر مساواتِ انسانیہ اور تکریمِ آدمیت کی تعلیم دیتا رہا۔ حضورؐ کی ساری زندگی اس بلند و برتر تعلیم کا عملی نمونہ رہی۔ آپ اس امر کا تصور بھی کر سکتے ہیں کہ اس تعلیم کا حامل رسولؐ یہ فیصلہ کرے گا کہ حکومت میرے قبیلہ کے اندر رہے گی۔

یہ ایک روایت قرآن کی بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو باطل قرار دے دینے کے لئے کافی ہے۔ لیکن ہماری تاریخ اس روایت کو رسول اللہؐ کی طرف منسوب کرتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے انصار اور مہاجرین کے بھرے مجمع میں اسے حق خلافت کے لئے بطور دلیل پیش کیا اور اسے سب نے تسلیم کر لیا۔ یعنی ہماری تاریخ، ایک ہی واقعہ میں، خدا کے رسولؐ اور ..... صحابہ کبارؓ کے متعلق نسل پرستی کا ایسا تصور پیدا کر جاتی ہے جسے مٹانے کے لئے قرآن آیا تھا۔

(۰)

رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد، صحابہ کبارؓ (انصار و مہاجرین) کا جو پہلا اجتماع ہوا، اس میں ہماری تاریخ (کے مطابق) ان حضرات کے باہمی تعلقات۔ اندازِ گفتگو اور اسلوبِ دلائل کا نقشہ ہمارے سامنے آگیا۔ اب اس سے آگے بڑھئے۔ (امام) طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:۔

دست و گریباں

سابقہ روایت کے سلسلہ سے عبداللہؓ بن عبدالرحمٰن سے مروی ہے کہ اب ہر طرف سے لوگ آ آ کر ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے۔ اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ ان کو نہ روندو، عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی عمرؓ نے کہا چھوڑ دو اگر اس کا ایک بال بھی ہیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت نہ رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سود مند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی بھی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کی گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہیں مانتے بلکہ میں ان کا اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھا لے چلو۔ ان کے آدمیوں نے ان کو اٹھا کر ان کے گھر میں پہنچا دیا۔ چند روز ان سے تعارض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آ کر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا یہ نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش خالی کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے رنگین نہ کر لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا۔ خدا کی قسم، اگر انسانوں کے ساتھ جن بھی تمہارے ساتھ ہو جائیں تب بھی جب تک کہ میں اپنے معاملے کو اپنے رب کے سامنے پیش نہ کر لوں بیعت نہیں کروں گا۔

(تاریخ طبری۔ جلد اوّل۔ حصّہ چہارم۔ اُردو ترجمہ۔ شائع کردہ۔ جامعہ عثمانیہ۔ صفحہ)

اس سے ایک صفحہ آگے ہے:۔

معاذ اللہ

ضحاک بن خلیفہ سے مروی ہے کہ امارت کے انتخاب کے موقع پر حباب بن المنذرؓ نے کھڑے ہو کر تلوار نکال لی اور کہا کہ میں ابھی اس کا تصفیہ کر دیتا ہوں۔ میں شیر ہوں اور شیر کی کھوہ میں ہوں اور شیر کا بیٹا ہوں۔ عمرؓ نے اس پر حملہ کیا اور اس کے ہاتھ پر وار کیا۔ تلوار گر پڑی، عمرؓ نے اسے اٹھا لیا اور پھر سعدؓ پر جھپٹے اور لوگ بھی سعدؓ پر جھپٹے۔ اب سب نے باری باری آ کر بیعت کی۔ سعدؓ نے بھی بیعت کی۔ اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔ ابوبکرؓ اس سے دور رہے، جس وقت سعدؓ پر لوگ جھپٹ گئے کسی نے کہا کہ تم لوگوں نے سعدؓ کو مار ڈالا۔ عمرؓ نے کہا اللہ اسے ہلاک کردے۔ وہ منافق ہے۔ عمرؓ کی تلوار کے سامنے ایک پتھر آ گیا اور ان کی ضرب سے وہ قطع ہو گیا۔

کلیجے پر ہاتھ رکھیے اور اس فقرہ کو پھر پڑھیے:۔

اس وقت عہدِ جاہلیت کا سا منظر پیش آیا اور تو تو میں میں ہونے لگی۔

بہرحال، حضرت ابوبکرؓ خلیفہ منتخب ہو گئے۔ اس کے بعد، دوسرے امیدوار حضرت سعدؓ کا کیا طرزِ عمل رہا، سنئیے:۔

اس کے بعد سعدؓ نہ ابوبکرؓ کی امامت میں نماز پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے حج میں بھی مناسک ان کے ساتھ ادا نہیں کرتے تھے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

(طبری۔ صـ)

داڑھیاں نوچنا!

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ سقیفہ کے تنازعے میں، حضرت سعدؓ نے حضرت عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی تھی۔ تاریخ طبری ہمیں بتاتی تھی کہ ایک دوسرے کی داڑھیاں نوچنا (معاذ اللہ) ان حضرات کا معمول سا ہو گیا تھا۔ چنانچہ لکھا ہے کہ جب حضرت اسامہؓ کی امارتِ عساکر کے مسئلہ میں حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ میں اختلافِ رائے ہوا تو

ابوبکرؓ جو بیٹھے ہوئے تھے غصے سے اچھل پڑے اور بڑھ کر انہوں نے عمرؓ کی داڑھی پکڑ لی اور کہا۔ اے ابنِ خطاب! اللہ تیری ماں کا برا کرے کہ تم مر جاتے۔ بھلا جس شخص کو رسول اللہؐ نے اس پر فائز کیا ہے۔ تم مجھ سے کہتے ہو کہ میں اسے علیحدہ کر دوں۔ (ایضاً۔ صـ۱۲)

یہ جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر انتخابِ خلیفہ اوّل کی تاریخی داستان کی طرف آئیے۔ اس تمام واقعہ میں حضرت علیؓ کا ابھی تک ذکر نہیں آیا۔ آپ یقیناً یہ معلوم کرنے کے لئے مشوش ہوں گے کہ جن بزرگوار (یعنی حضرت علیؓ) کے دل میں سب سے پہلے خلافت کا خیال پیدا ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب پر ان کی طرف سے کیا ردِّ عمل ہوا۔ تاریخ اس کے متعلق تفصیل سے بتاتی ہے۔ سنئیے محمد حسین ہیکل (مصری) اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

حضرت علیؓ کا ردِّ عمل

مہاجرین اور انصار کے چند افراد حضرت ابوبکرؓ کی بیعت میں شامل نہ تھے بلکہ ان کا میلان حضرت علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں سے مشہور لوگ یہ تھے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل بن عباسؓ، زبیرؓ بن عوام بن العاص، خالد بن سعیدؓ، مقداد بن عمروؓ، سلمان فارسیؓ، ابوذر غفاریؓ، عمار بن یاسرؓ، براء بن عازبؓ،

ابی بن کعبؓ۔ ابوبکرؓ نے عمرؓ، ابوعبیدہؓ بن جراح، مغیرہ بن شعبہؓ سے ان لوگوں کے بارے میں مشورہ کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ آپ عباسؓ بن عبدالمطلب سے ملئے اور خلافت میں اُن کا حصہ بھی رکھ دیجئے جو ان کی اولاد کی طرف منتقل ہو جائے۔ اس طرح ان کے اور ان کے بھتیجے علیؓ بن ابی طالب کے درمیان اختلاف واقع ہو جائے گا اور یہ بات آپ کو علیؓ کے مقابلہ میں فائدہ مند ثابت ہوگی۔

اس مشورہ کے مطابق ابوبکرؓ عباسؓ سے ملے تو دونوں کے درمیان طویل گفتگو ہوئی۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: "آپ رسول اللہؐ کے چچا ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ خلافت میں آپ کا حصہ بھی موجود ہو۔ جو آپ کے بعد آپ کی اولاد میں منتقل ہوتا رہے۔" لیکن عباسؓ نے یہ پیش کش رد کردی کہ اگر خلافت ہمارا حق ہے تو ہم ادھوری خلافت لینے پر رضامند نہیں ہو سکتے۔ (ابوبکرؓ صفحہ ۱۹)

اس کے بعد ہیکل لکھتا ہے:۔

ایک اور روایت میں جسے یعقوبی اور بعض دیگر مؤرخین نے بھی ذکر کیا ہے مذکور ہے کہ مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت حضرت علیؓ کی بیعت کرنے کے ارادے سے حضرت فاطمۃ الزہراؓ بنت رسول اللہ کے گھر میں جمع ہوئی۔ ان میں خالد بن سعیدؓ بھی تھے۔ خالدؓ نے حضرت علیؓ سے کہا:

"اللہ کی قسم! رسول اللہؐ کی جانشینی کے لئے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی نہیں۔ اس لئے آپ ہماری بیعت قبول کیجئے۔"

جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو اس اجتماع کی خبر ملی تو وہ چند لوگوں کو لے کر حضرت فاطمہؓ کے گھر پہنچے اور اس پر حملہ کر دیا۔ حضرت علیؓ تلوار ہاتھ میں لے کر گھر سے باہر نکلے۔ سب سے پہلے ان کی مڈبھیڑ حضرت عمرؓ سے ہوئی۔ حضرت عمرؓ نے ان کی تلوار توڑ ڈالی اور وہ دوسرے لوگوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہو گئے۔ اس پر حضرت فاطمہؓ گھر سے باہر آئیں اور کہا:۔

"یا تو تم میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ اللہ کی قسم میں اپنے سر کے بال نوچ لوں گی۔ اور تمہارے خلاف اللہ سے مدد طلب کروں گی۔" حضرت فاطمہؓ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر سب لوگ گھر سے باہر نکل گئے۔

کچھ روز تک تو مذکورہ بالا اصحاب بیعت سے انکار کرتے رہے۔ لیکن آہستہ آہستہ یکے بعد دیگرے سب نے بیعت کر لی۔ سوا حضرت علیؓ کے جنہوں نے چھ سات مہینے تک بیعت نہ کی۔ مگر حضرت فاطمہؓ کی وفات کے انہوں نے بھی بیعت کر لی۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علیؓ نے چالیس روز بعد بیعت کی تھی۔ ایک اور روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے ارادہ کر لیا تھا کہ اگر بنو ہاشم حضرت فاطمہؓ کے گھر میں خفیہ مجالس منعقد کرنے سے باز نہ آئے تو وہ ایندھن جمع کر کے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ (ایضاً صفحہ ۱۲)

اس وقت تک جو کچھ سامنے آیا ہے۔ اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ حضرت علیؓ نے اپنے موقف کی تائید میں دلیل کیا

پیش کی تھی۔ اب وہ دلیل سنئے۔ ہیکل لکھتا ہے:۔

حضرت علیؓ کی دلیل

حضرت علیؓ اور دیگر بنی ہاشم کے بیعت نہ کرنے سے متعلق مشہور ترین روایت وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "الامامۃ والسیاسۃ" میں درج کی ہے۔ وہ یہ کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے بعد حضرت عمرؓ چند لوگوں کو ساتھ لے کر بنی ہاشم کے پاس گئے جو اس وقت حضرت علیؓ کے گھر جمع تھے تاکہ ان سے بھی بیعت کا مطالبہ کریں۔ لیکن سب لوگوں نے حضرت عمرؓ کا مطالبہ ماننے سے انکار کر دیا۔ زبیرؓ بن عوام تو تلوار ہاتھ میں لے کر حضرت عمرؓ کے مقابلہ کے لئے باہر نکل آئے۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:۔

"زبیرؓ کو پکڑ لو"

لوگوں نے زبیرؓ کو پکڑ کر تلوار ان کے ہاتھ سے چھین لی۔ اس پر مجبوراً زبیرؓ نے جا کر حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ حضرت علیؓ سے بھی بیعت کرنے کا مطالبہ کیا گیا۔ لیکن انہوں نے انکار کر دیا اور کہا۔ میں تمہاری بیعت نہ کروں گا کیونکہ میں تم سے زیادہ خلافت کا حقدار ہوں اور تمہیں میری بیعت کرنی چاہئے تھی۔ تم نے یہ کہہ کر انصار کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں اور آپ کے قریبی عزیز ہی خلافت کے حقدار ہیں۔ اس اصول کے مطابق تمہیں چاہیئے تھا کہ خلافت ہمارے حوالے کرتے مگر تم نے اہل بیت سے چھین کر خلافت غصب کر لی۔ کیا تم نے انصار کے سامنے یہ دلیل پیش نہ کی تھی کہ ہم خلافت کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ رسول اللہؐ ہم میں سے تھے۔ اس لئے تم ہماری اطاعت قبول کرو اور خلافت ہمارے حوالے کرو۔ وہی دلیل جو تم نے انصار کے مقابلے میں پیش کی تھی اب میں تمہارے مقابلے میں پیش کرتا ہوں۔ ہم تم سے زیادہ رسول اللہؐ کے قریبی عزیز ہیں۔ اس لئے خلافت ہمارا حق ہے۔ اگر تم میں ذرہ برابر ایمان ہے تو ہم سے انصاف کر کے خلافت ہمارے حوالے کرو۔ لیکن اگر تمہیں ظالم بننا پسند ہے تو جو تمہارا جی چاہے کرو تمہیں اختیار ہے۔ (ایضاً صـ۱۲۲)

آپ نے غور فرمایا کہ تاریخ نے جو دلیل حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کی طرف منسوب کی تھی (کہ خلافت قریش میں رہے گی اور ہم رسول اللہؐ کے اہل خاندان ہیں) اسے (تاریخ نے) کس سادگی سے حضرت علیؓ کی طرف لوٹا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دلیل کے بعد سنی حضرات کا موقف اس قدر کمزور ہو جاتا ہے کہ ان سے کوئی اطمینان بخش جواب نہیں بن پڑ سکتا۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ (تاریخ نے) یہ دلیل اولاً حضرات شیخینؓ کی طرف کیوں منسوب کی تھی!

بہرحال، حضرت علیؓ کے اس جواب پر حضرت عمرؓ نے کہا:۔

میں اس وقت تک آپ کو نہ چھوڑوں گا جب تک آپ بیعت نہ کریں گے۔ (ایضاً۔ صـ۱۲۲)

اس کے بعد:۔

سرگرمیاں

حضرت علیؓ اس وقت تیزی میں آگئے اور کہنے لگے "عمرؓ! تم شوق سے دودھ دوہو جس میں تمہارا بھی حصہ ہے آج تم اس لئے خلافتِ ابوبکرؓ کی حمایت کر رہے ہو کہ کل کو خلافت تمہارے پاس لوٹ آئے گی لیکن میں کبھی ان کی بیعت نہ کروں گا۔"

حضرت ابوبکرؓ کو ڈر پیدا ہوا کہ کہیں بات بڑھ نہ جائے اور درشت کلامی تک نوبت نہ آ جائے انہوں نے کہا "علیؓ! اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں بھی تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس پر ابوعبیدہؓ بن الجراح حضرت علیؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور نہایت نرمی سے کہا۔ "بھتیجے! تم ابھی کم عمر ہو اور یہ لوگ بزرگ ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ حاصل ہے اور نہ تم ان کی طرح جہاندیدہ ہو۔ اگر قوم میں کوئی شخص رسول اللہؐ کی جانشینی کے فرائض صحیح طور پر بجا لا سکتا اور خلافت کا بوجھ کما حقہٗ اٹھا سکتا ہے تو وہ صرف ابوبکرؓ ہیں اس لئے تم ان کی خلافت قبول کر لو۔ اگر تم نے لمبی عمر پائی تو یقیناً اپنے علم و فضل۔ دینی رتبے فہم و ذکا، سابقیتِ اسلام، حسب و نسب اور رسول اللہؐ کی دامادی کا شرف حاصل ہونے کے باعث تمہیں خلافت کے مستحق ٹھہرو گے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ کے جوش کی انتہا نہ رہی اور وہ غصے سے بولے۔ "اللہ اللہ! اے گروہ مہاجرین! تم رسول اللہؐ کی حکومت کو آپ کے گھر سے نکال کر اپنے گھروں میں داخل نہ کرو۔ آپ کے اہل بیت کو ان کے صحیح مقام پر سرفراز کرو اور ان کا حق انہیں دو۔ اے مہاجرین! اللہ کی قسم! ہمیں خلافت اور حکومت کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں۔ ہم اس وقت تک اس کے حقدار ہیں جب تک ہم میں اللہ کی کتاب کا قاری، دین کا فقیہہ، رسول اللہ کی سنت کا عالم، رعایا کی ضرورت سے واقف، ان کی تکالیف کو دور کرنے والا اور ان سے مساوات کا سلوک کرنے والا قائم ہے اور اللہ جانتا ہے کہ ہم میں ان صفات کا حامل موجود ہے، اس لئے اپنی خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کے راستے سے گمراہی اختیار نہ کرو۔ اور حق کے راستے سے دور نہ چلے جاؤ۔" راویوں کے بیان کے مطابق بشیر بن سعدؓ بھی اس موقع پر موجود تھے۔ جب انہوں نے حضرت علیؓ کی باتیں سنیں تو کہا۔ "اے علیؓ! اگر یہ باتیں جو اس وقت تم نے کہی ہیں انصار کا گروہ ابوبکرؓ کی بیعت سے پہلے سن لیتا تو وہ لوگ تمہارے سوا کسی کی بیعت نہ کرتے۔"

اس گفتگو کے بعد حضرت علیؓ طیش میں بھرے ہوئے گھر چلے گئے۔ جب رات ہوئی تو وہ حضرت فاطمہؓ کو لے کر باہر آئے اور انہیں ایک خچر پر بٹھا کر انصار کے پاس لے گئے۔ حضرت فاطمہؓ گھر گھر جائیں اور ان سے حضرت علیؓ کی مدد کرنے کی درخواست کرتیں۔ لیکن ہر جگہ سے انہیں یہی جواب ملتا۔

"اے بنتِ رسول اللہؐ! ہم ابوبکرؓ کی بیعت کر چکے ہیں۔ اگر آپ کے خاوند بیعت سے قبل ہمارے پاس آتے تو ہم ضرور ان کی بیعت کر لیتے۔"

یہ سن کر حضرت علیؓ غصہ میں آ کر جواب دیتے۔ "کیا میں رسول اللہؐ کی نعش کو بلا تجہیز و تکفین

چھوڑ دیتا اور باہر نکل کر آپ کی جانشینی کے متعلق لڑتا جھگڑتا پھرتا؟"
حضرت فاطمہؓ بھی کہتیں۔ "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کیا جو ان کے لئے مناسب تھا۔ باقی ان لوگوں نے جو کچھ کیا اللہ ان سے ضرور اس کا حساب لے گا اور باز پرس کرے گا۔"
(ایضاً۔ ص ۱۲۲-۱۲۵)

ہیکل نے ان واقعات کو مختلف حوالوں سے نقل کیا ہے۔ اس باب میں بخاری میں حسب ذیل روایت آئی ہے:۔

بخاری کی حدیث

حضرت فاطمہؓ نبی صلعم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں۔ جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابوبکرؓ کو اطلاع نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جبتک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہو گیا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت[1] نہیں کی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ابوبکر کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ "نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے۔" اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کر لیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔" چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔ "ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو حق تعالیٰ آپ کو عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے لیکن تم نے امرِ خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے[2] ہم سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلعم سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے[3]۔"
ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکرؓ صدیق منبر پر چڑھے اور خطبہ دیا، اور بیعت سے علیؓ کے

---

[1] بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ کیا ہے۔ "معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔
(ابن جریر طبری۔ جلد اوّل۔ حصہ سوم۔ اردو ترجمہ جامعہ عثمانیہ۔ ص ۵۹۶)

[2] ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقع پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔ (ایضاً)

[3] ابن جریر طبری نے اپنے ہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبددتم به علینا۔ یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ایضاً)

کے تخلّف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا تھا اسے پیش کیا پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کو بیان کیا اور کہا کہ اب تک انہوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا اور نہ اس فضیلت سے کسی انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امرِ خلافت میں ہمارا حصّہ ہے اور ابوبکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔ (صحیح بخاری۔ کتاب المغازی)

بخاری کی اس روایت میں چند باتیں بڑی غور طلب ہیں۔ مثلاً

(۱) حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ سے اس قدر ناراض تھے کہ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کی وفات کی اطلاع تک نہیں دی۔ اور چپکے ہی چپکے انہیں رات کو دفن کر دیا۔

(۲) جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، حضرت علیؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی لیکن ان کی وفات کے فوری بعد انہوں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی نظروں میں ان کا پہلا سا وقار باقی نہیں رہا۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی جائے۔

(۳) حضرت علیؓ نے اپنے حقِ خلافت کے لئے یہ دلیل دی کہ وہ رسول اللہؐ کے قرابت دار ہیں۔

آپ غور کیجیے کہ تاریخ کے اس بیان کو اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس سے حضرت علیؓ کے متعلق کیا تصور قائم ہوتا ہے؟

تاریخ کے بیان کے مطابق، حضرت علیؓ نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے انہیں خلافت سے محروم رکھا ہے انہوں نے غصب اور استبداد سے کام لیا ہے۔ یہی وہ "جرم" ہے جس کی بنا پر شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد، بجز چند اصحاب (جنہوں نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) باقی سب (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔

صحابہؓ کا ارتداد؟

اس کے متعلق سُنّی حضرات یہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ عقیدہ تعصّب پر مبنی ہے۔ لیکن اس کا کیا جواب کہ خود ان کی (حدیث کی) معتبر ترین کتاب، بخاری میں حسب ذیل روایت موجود ہے:۔

حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم لوگ برہنہ پا۔ برہنہ بدن۔ بغیر ختنہ کئے حشر کئے جاؤ گے۔ آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔ كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ (۲۱/۱۰۴) اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں۔ اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لئے جا رہے ہوں گے۔ میں کہوں گا یہ تو میرے صحابہؓ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے[1] جب سے آپ ان کے پاس سے جدا ہوئے۔ پس میں کہوں گا جیسا کہ نیک بندے

---

[1] بخاری کے اصلی الفاظ "مرتدین علیٰ اعقابھم" ہیں۔

(یعنی عیسیٰؑ) نے کہا تھا۔ وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ..... (۵/۱۱۷)

(بخاری کتاب الانبیاء ترجمہ شائع کردہ نور محمد تاجر کتب کراچی۔ جلد دوم۔ صـ۱۴۹)

سوچئے کہ بخاری کی اس حدیث کی رُو سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے؟ یہ وہ صحابہؓ ہیں جن کے متعلق قرآن شہادت دیتا ہے کہ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا..... (۸/۴) یہی لوگ ہیں جو حقیقی مومن ہیں"۔ اگر ان مومنین کے ایمان کی بھی یہ کیفیت تھی کہ اُدھر رسول اللہؐ نے آنکھیں بند کیں اور اِدھر یہ (معاذ اللہ) ایمان سے پھر گئے، تو یہ دیگراں چہ رسد؟ اور اگر کوئی معترض یہ کہہ دے (اور کہنے والے کہتے ہی ہیں) کہ "درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے"۔ تو سوچئے کہ (ان روایات کی رُو سے) خود نبی اکرمؐ کے متعلق (معاذ اللہ) کیا تصور سامنے آتا ہے۔

(۰)

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ جس تاریخ کی یہ کیفیت ہے اُسے مسترد کیوں نہ کر دیا جائے؟ ایسا کرنے میں کونسا امر مانع ہے؟ یہ بات بڑی معقول ہے اور ایسا کرنے میں کوئی دِقت نہیں ہونی چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہماری تاریخ کو تاریخ کے مقام سے اٹھا کر دین بنا لیا گیا ہے۔ ان احادیث کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے، رسول اللہؐ کو بذریعہ وحی خفی ملی تھیں۔ اس لئے یہ قرآن کے ساتھ، قرآن کی مثل ہیں (مثلہٗ معہٗ) اتنا ہی نہیں، ان کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ اگر قرآن اور حدیث میں تضاد نظر آئے تو قرآن کو منسوخ سمجھو اور حدیث کو برقرار رکھو۔

تاریخ، دین بن چکی ہے

کراچی کے ادارہ "تحقیقِ حق" کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا ہے جس کا نام ہے "فتنہ انکارِ حدیث" اس کے مصنف ہیں "علامہ حافظ محمد ایوب صاحب دہلوی" وہ اس پمفلٹ میں لکھتے ہیں:۔

اگر کوئی کہے کہ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ (۵/۴۸) کے کیا معنی ہیں۔ نبی سے یہ کہا جا رہا ہے کہ تو کتاب اللہ کے ساتھ ان کے درمیان فیصلہ کر۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ "مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" کے معنی صرف کتاب اللہ نہیں ہے۔ بلکہ "مَا أَنْزَلَ اللَّهُ" کتاب اللہ بھی ہے اور حدیثِ رسول اللہ بھی۔ (صـ۵۲)

اس کے بعد لکھتے ہیں:۔

حدیث، قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے

یعنی یہ بات کہ قولِ رسول قرآن کے خلاف ہو تو وہ بھی حجت ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ قرآن میں ہے: كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ.. (۲/۱۸۰) تمہارے اوپر والدین کی وصیت فرض ہے۔ اگر کسی نے مال چھوڑا ہے جب کہ اسے موت آئے۔ رسول اللہ نے فرمایا۔ لاوصیۃ للوارث۔ وارث کے لئے وصیت نہیں اور

تواتر سے ثابت ہے کہ عمل اسی حدیث پر رہا ہے۔ یعنی وارث کے لئے وصیت ناجائز قرار دی گئی۔ حدیث نے قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیا اور قولِ رسولؐ قرآن کی آیت کے خلاف حجت اور موجبِ عمل رہا۔ (صفحہ ۸۵)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:۔

اب اگر کہا جائے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ رسولؐ کا کوئی قرآن کے خلاف ہو اور رسولؐ کا قول قرآن کو فسخ کر دے! تو پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ رسولؐ کا قول اس کا اپنا قول نہیں ہوتا۔ وہ درحقیقت خدا کا قول ہوتا ہے۔ جس طرح قرآن خدا کا قول ہے اسی طرح رسولؐ کا قول بھی خدا کا قول ہے۔ اور جس طرح قرآن کی ایک آیت قرآن کی دوسری آیت کو منسوخ کر دیتی ہے۔ اسی طرح خدا کا ایک قول (یعنی قولِ رسولؐ) دوسرے قول (یعنی قرآن) کو منسوخ کر دیتا ہے۔ (صفحہ ۸۶)

ہم نے یہ کہا تھا کہ ہمیں چاہیئے کہ ہم قرنِ اوّل (عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ) کی تاریخ کے ذخیرہ کو قرآن کی روشنی میں پرکھ لیں۔ جو باتیں قرآن کے مطابق ہوں انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ جو اس کے خلاف ہوں انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں حافظ ایوب صاحب نے فرمایا:۔

قرآن اور حدیث میں اختلاف ہو سکتا ہے

جس طرح خدا کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں کہ وہ عقل کے مطابق ہو۔ بالکل اسی طرح نبیؐ کے قول کے حجت ہونے میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ قرآن کے مطابق ہو۔ **اس لئے کہ نبی کا قول بھی قول اللہ ہے** اور قرآن بھی قول اللہ ہے اور اللہ کے دونوں قول ہیں۔ قرآن بھی اور حدیثِ رسولؐ بھی۔ تو اللہ کے قول کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں تنوع نہ ہو۔ جس طرح کہ اس کے ایک فعل کے لئے ضروری نہیں ہے کہ وہ دوسرے فعل کے مطابق ہو۔ ایک طرف پہاڑ کی چوٹی فلک تک پہنچ رہی ہے۔ دوسری طرف کھڈ کی گہرائی تحت الثریٰ تک پہنچ رہی ہے۔ جس طرح اس کے ایک فعل کا دوسرے فعل کے مطابق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسی طرح اس کے ایک قول کا (یعنی حدیثِ رسولؐ کا) اس کے دوسرے قول (یعنی قرآن) کے مطابق ہونا

---

* جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے، قرنِ اوّل کی تاریخ کا کچھ حصّہ کتبِ احادیث میں ہے اور کچھ حصّہ کتبِ سیر و آثار میں۔ کتبِ احادیث کو قرآن کے ہم پایہ بلکہ قرآن کا ناسخ ماننے والوں پر یہ بات بھی گراں گزرتی ہے کہ احادیث کو تاریخ کہہ دیا جائے۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ واقعہ خلافتِ اوّل کے متعلق بخاری کی جو احادیث سابقہ صفحات میں درج کی گئی ہیں وہ اگر تاریخی بیانات نہیں تو اور کیا ہیں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود امام بخاری نے اپنی اس کتاب (مجموعۂ احادیث) کا نام "الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ و ایامہٖ" رکھا تھا (بحوالہ "تدوینِ حدیث" مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم) اس سے واضح ہے کہ خود امام بخاری کے نزدیک ان کی کتاب تاریخ کی کتاب تھی۔

ضروری نہیں ہے۔ (ص ۵)

—————(۰)—————

ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے:۔

یکثر لکم الاحادیث من بعدی. فاذا روی عنی حدیث فاعرضوہ علیٰ کتاب اللہ۔ فما وافق فاقبلوہ۔ وما خالف فردوہ۔

(بحوالہ کتاب التوضیح والتلویح۔ ص ۴۳)

یعنی رسول اللہؐ نے فرمایا کہ "میرے بعد تم سے بہت سی احادیث بیان کی جائیں گی۔ سو جب کوئی حدیث میری طرف سے روایت کی جائے تو اسے کتاب اللہ کے سامنے پیش کرو جو اس کے موافق ہو اسے قبول کرلو۔ جو اس کے خلاف ہو اسے رد کردو۔" اس حدیث کے صحیح ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ یہ قرآن کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ ان حضرات کی طرف سے اس کا کیا جواب ملا؟ جماعت اہل حدیث کے ترجمان ماہنامہ، رحیق نے اپنی اپریل ۱۹۵۵ء کی اشاعت میں لکھا۔

حدیث کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے یہ عقیدہ مُلحِدوں کا ہے!

اس حدیث کو ملحدوں نے وضع کیا تھا اور انہی ملحدوں کے خیالات کی خوشہ چینی بکواس ازم کے پیمبران کررہے ہیں۔ امام خطابیؒ اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں: وضعه الزنادقة الذین مقصودهم افساد الدین ویدفعه قوله صلی اللہ علیہ وسلم انی اوتیت الکتاب ومثله معه۔

(ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی۔ ص ۲۶۷)

یعنی "یہ روایت ان زندیقوں اور حدیث دشمنوں کی خود ساختہ حدیث ہے جن کا مقصد احادیث کو رد کردینے سے دینی نظام کا فاسد و باطل کردینا ہے۔ اور اس حدیث کا بطلان آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے خود ہو جاتا ہے جس میں ارشاد ہے کہ میں قرآن دیا گیا ہوں اور قرآن کے مانند بھی دیا گیا ہوں۔ پس "حدیث" ہی قرآن کے مانند ہے۔ کیونکہ دوسری روایت میں تشریح ہے کہ "قرآن کے مانند" کا نام "حدیث" ہے۔ وہ روایت یہ ہے: لَا اُلْفِیَنَّ احدکم متکئا علیٰ اریکته یصل الیه عنی الحدیث فیقول لا نجد هذا الحکم فی القرآن الا وانی اوتیت القرآن ومثله ومعه۔ (ظفر الامانی ص ۲۶۷) دوسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں: لیوشك الرجل متکئا علیٰ اریکته یحدث بحدیثی فیقول بیننا وبینکم کتاب اللہ الحدیث۔ (دارمی ص ۱۴۰ جلد اوّل طبع مصر) اس قسم کی روایات الکفایہ (ص ۱۰۹) میں خطیبؒ نے ذکر کی ہیں جن میں صاف تصریح ہے کہ حدیث

کو رد نہ کرو۔ مجھے قرآن کی طرح اور اس کی مانند "حدیث" بھی دی گئی ہے۔ امام خطابیؒ کی طرح امام شافعیؒ ـــ امام المحدثین عبدالرحمٰنؒ ابن مہدی وغیرہ نے بھی اس حدیث کو زندیقوں کا وضع کردہ لکھا ہے۔ امام بیہقیؒ نے بھی فرمایا ہے کہ جو روایت سنتِ نبویہؐ کو قرآن پر پیش کرنے کی خاطر بنائی گئی ہے وہ باطل ہے۔ علامہ ہیثمیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں ایک راوی متروک منکر الحدیث ہے۔ (مجمع الزوائد۔ جلد اوّل صـ۶۸)

یعنی یہ مسلک کہ جو کچھ قرآن کے مطابق ہو اُسے صحیح سمجھو۔ جو اس کے خلاف ہو، اسے غلط قرار دو (ان حضرات کے نزدیک) ملحدین اور زنادقہ کا وضع کردہ ہے!

خرد کا نام ہے جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد ۔۔۔ جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

(۰)

گذشتہ اوراق میں جو اوراق آپ کی نظروں سے گذرے ہیں، ان سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آچکی ہے کہ ہماری کتبِ احادیث و سیر و آثار میں ایسی باتیں موجود ہیں جو

(۱) قرآنِ کریم کی واضح تعلیم کے یکسر خلاف ہیں۔

(۲) جن سے نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی پر حرف آتا ہے۔

(۳) جن سے صحابہ کبارؓ کی سیرت و کردار مطعون ہو جاتے ہیں۔

(۴) جو علم و عقل کے بھی خلاف ہیں۔

اس کے بعد آپ کے دل میں لازماً یہ سوال اُبھرے گا کہ

یہ کیسے ہوا | (ا) اس قسم کی باتیں ان کتابوں میں آ کیسے گئیں؟

(ب) ہزار برس سے یہ متواتر آگے منتقل کیسے ہوتی رہیں۔ یعنی لوگوں نے اس قسم کی باتوں کو ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟ اور

(ج) آج بھی ہمارا قدامت پرست طبقہ ان باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر مصر کیوں ہے؟ اور

یہ سوالات ہر اس شخص کے دل میں پیدا ہونے چاہئیں جو ذرا بھی عقل و بصیرت سے کام لے اور ان امور پر غور و فکر کرے۔ جہاں تک پہلی دو شقوں کا تعلق ہے (یعنی اس قسم کی باتیں ہمارے لٹریچر میں آ کیسے گئیں؟ اور قوم نے انہیں ان کتابوں سے خارج کیوں نہ کر دیا؟) اس کے متعلق تفصیلی بحث کی ضرورت ہے اور اس کے لئے مناسب موقعہ وہ ہے جب ہم اپنی پوری تاریخ کا از سرِ نو جائزہ لیں اور اس کے ایک ایک گوشے کے متعلق ریسرچ کریں ـــ ظاہر ہے کہ ایک مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ ہم سرِ دست صرف اس نکتہ کو پیش کریں گے کہ آج بھی اس قسم کی باتوں کو صحیح ماننے اور صحیح منوانے پر اس قدر زور کیوں دیا جا رہا ہے؟ اس نقطہ کی وضاحت ایک واقعہ سے ہو جائے گی۔ اسے غور سے سنیئے۔

۱۹۵۸ء کی بات ہے کہ (کالعدم) جماعتِ اسلامی کے ارباب بست وکشاد کا ایک حلقہ...... جماعت سے الگ ہو گیا۔ ان الگ ہونے والے حضرات نے اپنی علیحدگی کی وجوہات میں ایک بڑی وجہ یہ بتائی تھی کہ جماعت کے دعویٰ اور اشاعتی دَور میں جن اصولوں کو دین کی محکم اساس کے طور پر پیش کیا جاتا تھا، نظام کے عملی قیام کے وقت ان سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اعتراض بڑا قبیح اور یہ جرم بڑا سنگین تھا۔ لیکن مرحوم) مودودی صاحب نے اس کے جواب میں کہا کہ میں) نے یہ کونسا انوکھا کام کیا ہے۔

ایسا معاذ اللہ رسول اللہؐ نے بھی کیا تھا!

(معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ نے اسلام کے اشاعتی دَور میں جو اصول بیان فرمائے تھے اس کے عملی قیام کے وقت ان میں لچک پیدا کر لی تھی۔ مثلاً

> اسلامی نظام کے اصولوں میں سے ایک یہ بھی تھا کہ تمام نسلی اور قبائلی امتیازات کو ختم کر کے اس برادری میں شامل ہونے والے سب لوگوں کو یکساں حقوق دیئے جائیں اور تقویٰ کے سوا فرق مراتب کی کوئی بنیاد نہ رہنے دی جائے۔ اس چیز کو قرآن مجید میں بھی پیش کیا گیا اور حضورؐ نے بھی بار بار اس کو نہ صرف زبانِ مبارک سے بیان فرمایا بلکہ عملاً موالی اور غلام زادوں کو امارت کے مناصب دے کر واقعی مساوات قائم کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ لیکن
>
> جب پوری مملکت کی فرمانروائی کا مسئلہ سامنے آیا تو آپ نے ہدایت دی کہ الائمۃ من قریش امام قریش میں سے ہوں۔
>
> ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ اس خاص مسئلہ میں یہ ہدایت مساوات کے اس عام اصول کے خلاف پڑتی ہے جو کلیہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ اس وضعی روایت سے جو ہماری کتب تاریخ میں درج ہے (اور جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے) مودودی (مرحوم) نے کس طرح فائدہ اٹھایا۔ ظاہر ہے کہ اگر معاملہ صرف قرآن تک رہتا اور دین میں اسی کو سند مانا جاتا تو مرحوم کو اپنی روش کی تائید میں کوئی دلیل و سند نہ مل سکتی۔ لیکن چونکہ تاریخ کو (قرآن کے برابر بلکہ اس سے بھی افضل) سند مان لیا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کا رطب و یابس مسالہ موجود ہے۔ اس لئے اس سے ہر شخص کو اس کے ہر فیصلے اور عمل کی سند مل سکتی ہے۔

جماعت سے الگ ہونے والوں نے اس کے جواب میں کہا:-

> غور فرمایئے۔ اگر یہ طریق کار خدا کے آخری نبیؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور اگر اسلامی تحریک اس اسوۂ حسنہ کے مطابق اس طریق کار کو اپنا معمول بناتی ہے اور ہر کوئی ایسی جماعت جو اقامتِ دین کی علمبردار ہو وہ اس اصول کو بطور فلسفہ اور عقیدہ کے طے کر لیتی ہے کہ

---

۱ ان تفاصیل کے لئے المنبر لائل پور بابت ۳۱ جنوری ۱۹۵۸ء اور طلوعِ اسلام بابت مارچ و جولائی ۱۹۵۸ء ملاحظہ فرمایئے۔

اسلامی نظام کے دعوتی اور اشاعتی دور میں جو اصول بیان کئے جائیں اور جن پر لوگوں کو جمع کیا جائے۔ جب اسلامی نظام کو عملاً قائم کرنے کا وقت آئے گا تو اس تحریک کے قائد کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ توحید و رسالت ایسے اساسی اصولوں کے علاوہ، تحریک کے مفاد کے لئے جس اصول میں ضروری خیال کرے استثناء پیدا کرے۔ اس پر عمل کرنے سے اپنی جماعت کو روک دے۔ جو ضمانت اس تحریک نے عوام کو اپنے ابتدائی دور میں دی ہو اس میں سے جس جزو کو وہ دین کی مصلحت کے لئے مضر خیال کرے ساقط کر دے (جیسا کہ مبینہ مثال میں حضورؐ نے مساوات اور حقِ خلافت ایسے اصول اور ضمانت پر صحابہؓ کو عمل کرنے سے روک دیا تھا) تو اس اسلامی تحریک اور اقامتِ دین کی جد و جہد، اور ان طالع آزما سیاست دانوں کی تحریکات کے مابین کیا فرق باقی رہ جائے گا جو حصولِ اقتدار سے پہلے نہایت پاکیزہ اصول بیان کرتے ہیں۔ بہت حسین وعدے عوام سے کرتے ہیں اور انہی اصولوں اور وعدوں کی بنیاد پر وہ لوگوں کی حمایت و تائید حاصل کر لیتے ہیں۔ جب انہیں اقتدار حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اقتدار کو قائم رکھنے کی عملی مشکلات سے مجبور ہو کر ان وعدوں اور اصولوں کی خلاف ورزی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جھوٹ بولنا بھی جائز ہے

اس پر مودودی (مرحوم) ایک قدم اور آگے بڑھے اور فرمایا کہ اقامتِ دین جیسے اہم مقصد کے حصول کے لئے اصولوں میں لچک اور استثنے تو ایک طرف ان کے لئے جھوٹ بولنا بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہو جاتا ہے۔ انہوں نے کہا:۔

راستبازی اور صداقت شعاری اسلام کے اہم ترین اصولوں میں سے ہے اور جھوٹ اس کی نگاہ میں ایک بدترین برائی ہے۔ لیکن عملی زندگی کی بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کی خاطر جھوٹ کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ بعض حالات میں اس کے وجوب تک کا فتویٰ دیا گیا ہے۔

(ترجمان القرآن - مئی ۱۹۵۸ء)

آپ حیران ہوں گے کہ مرحوم نے ایسا کہنے کی جرأت کیسے کر لی اور اس کی تائید میں ان کے پاس کون سی سند ہو سکتی تھی؟ لیکن جس تاریخ سے انہوں نے پہلی سند پیش کی تھی اسی سے انہیں اس کی سند بھی مل گئی۔

حدیث سے اس کا ثبوت

چنانچہ انہوں نے "جھوٹ کے وجوب" میں دو تین حدیثیں نقل کر دیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ

اسماء بنت یزید نبی اکرمؐ سے روایت کرتی ہیں کہ جھوٹ جائز نہیں ہے۔ مگر تین چیزوں میں۔ مرد کی بات عورت سے تاکہ وہ اسے راضی کرے۔ جنگ اور اصلاح بین النّاس۔ (ترمذی)

اس کے بعد انہوں نے (معاذ اللہ) نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ سے بھی اس کی مثالیں پیش کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

اس کی عملی مثالیں بھی احادیث میں موجود ہیں۔ کعب بن اشرف کے قتل کے لئے محمد بن مسلم کو جب حضورؐ نے مامور کیا تو انہوں نے اجازت مانگی کہ اگر کچھ جھوٹ بولنا پڑے تو بول سکتا ہوں؟ حضورؐ نے بالفاظِ صریح انہیں اس کی اجازت دی۔ (بخاری)

امید ہے کہ اس سے یہ بات آپ کی سمجھ میں آ گئی ہو گی کہ یہ حضرات تاریخ اور روایات کے اس قسم کے بیانات اور واقعات کو (جن کا خلافِ قرآن اور غلط ہونا بدیہیات میں سے ہے) سچا اور دین میں سند تسلیم کرانے پر کیوں زور دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر سند قرآن رہے اور اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ قرنِ اوّل کی تاریخ کا جو بیان قرآن کے خلاف ہے وہ غلط ہے، تو کسی کو اپنی فریب کاریوں اور کذب تراشیوں کے لئے دینی سند نہیں مل سکتی۔ ایسا اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب اس قسم کے تاریخی بیانات کو دین میں سند تسلیم کرا لیا جائے۔ اور پھر انہیں اپنے فیصلوں کی تائید میں پیش کر دیا جائے۔ اس سے ہمارا مطلب یہ نہیں کہ اس طبقہ کے تمام افراد اسی جذبہ کے تحت ان باتوں کو صحیح مانتے اور صحیح منواتے ہیں۔ ان میں بیشتر حصہ ان افراد پر مشتمل ہے جو ان باتوں کو نیک نیتی سے سچا مانتا ہے۔ یہ اس لئے کہ صدیوں کی تقلید سے ان میں سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ ان کے نزدیک دین کے معاملات میں غور و فکر سے کام لینا جائز نہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے، وہی صحیح ہے اس پر کسی قسم کی تنقید نہیں کی جا سکتی۔ یہ حضرات اس تاریخ کی حفاظت و ترویج کو عین دینی خدمت سمجھتے ہیں۔ مفاد پرست طبقہ اس سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ یہی وہ طبقہ ہے جس نے اس قسم کی باتیں وضع کر کے انہیں ابتداءً ہماری تاریخ میں شامل کیا تھا۔ یہی اسے صدیوں سے مسلسل و متوارث آگے بڑھائے چلا آ رہا ہے اور یہی آج اس کے تحفظ کا سب سے بڑا علمبردار بن کر سامنے آتا ہے۔

اسلام اور نظامِ سرمایہ داری

اس کی ایک مثال سنیئے۔ ہم شروع میں بتا چکے ہیں کہ قرآن نے جس نظام کو الدین کہا ہے اس میں فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہیں رہتی۔ وہ نوعِ انسانی کی بہبود کے لئے اُمت (یا نظام) کی تحویل میں چلی جاتی ہے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم ایسی واضح، بیّن اور صاف ہے کہ اس میں کسی قسم کی تاویل و تعبیر کی گنجائش نہیں۔ ظاہر ہے کہ عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہٗ (رضی اللہ تعالےٰ عنہم اجمعین) میں قرآن کی اسی تعلیم پر عمل ہوتا رہا۔ لیکن اس کے بعد جب خلافت ملوکیت میں بدل گئی اور سرمایہ دارانہ نظام ہجوم کر کے آ گیا تو اس کی ضرورت پڑی کہ اس کی تائید اور جواز کے لئے سندیں وضع کی جائیں۔ یہ اسناد قرآن سے تو مل نہیں سکتی تھیں کیونکہ اس میں تغیر و تبدل اور حک و اضافہ کی گنجائش نہیں تھی۔ اس کے لئے تاریخ کا چور دروازہ ہی کام دے سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور اس قسم کی روایات وضع کیں جن سے نظامِ سرمایہ داری، زمینداری اور جاگیرداری کا نظام عین مطابقِ سنتِ رسول اللہؐ و سنتِ صحابہؓ قرار پا جائے۔

مشکوٰۃ کی ایک حدیث

مثلاً ایک روایت میں ہے:۔

ابنِ عباسؓ کہتے ہیں کہ جس وقت یہ آیت نازل ہوئی.....

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (۹/۳۴) "جو لوگ سونے اور چاندی کو جمع کرتے ہیں اور اسے خدا کی راہ میں کھلا نہیں رکھتے۔ اے رسولؐ تو انہیں دردناک عذاب سے آگاہ کر دے" تو مسلمانوں پر اس کا خاص اثر ہوا یعنی انہوں نے اس حکم کو گراں خیال کیا۔ حضرت عمرؓ نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہاری اس فکر کو دور کر دوں گا۔ اور اس مشکل کو حل کروں گا۔ پس عمرؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا، یا نبیؐ اللہ یہ آیت آپؐ کے صحابہؓ پر گراں ہوئی ہے۔ آپؐ نے فرمایا خداوند تعالیٰ نے زکوٰۃ اس لئے فرض کی ہے کہ وہ تمہارے باقی مال کو پاک کر دے اور میراث کو اس لئے فرض کیا ہے کہ جو لوگ تمہارے بعد رہ جائیں ان کو مال مل جائے۔ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ کا یہ بیان سن کر عمرؓ نے جوشِ مسرت سے اللہ اکبر کہا۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ میں تم کو ایک ایسی بہترین چیز کا پتہ نہ دوں جس کو انسان جمع کر کے خوش ہو اور وہ چیز نیک بخت عورت ہے۔ اس کی طرف مرد دیکھے تو اس کا دل خوش ہو اور جب مرد اس کو کوئی حکم دے تو وہ اس کی اطاعت کرے اور جب وہ غائب ہو تو اس کے مال و دولت کی حفاظت کرے۔ (ابو داؤد) (مشکوٰۃ جلد اوّل۔ اُردو ترجمہ ص ۳۰۹)

یہ روایت زبانِ حال سے پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ وضع کردہ ہے۔ یہ کبھی تصور میں بھی نہیں آسکتا ہے کہ خدا کا ایک حکم ہو اور صحابہؓ پر وہ گراں گذرے؟ پھر ان میں سے (کوئی اور بھی نہیں) حضرت عمرؓ اس حکم کو بدلوانے کے لئے رسول اللہؐ کے پاس جائیں۔ اور رسول اللہؐ خدا کے اس حکم کو یوں بدل دیں کہ اگر تم اڑھائی فی صد سالانہ ادا کر دو تو تمہیں اجازت ہے کہ سونے چاندی کے ڈھیر جمع کرتے رہو۔ روایت کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بعد کے دور کی وضع کردہ ہے۔ لیکن چونکہ اس سے سرمایہ دارانہ نظام کا تحفظ ہوتا ہے اس لئے مفاد پرست گروہ اسے صحیح ترین حدیث قرار دے کر برابر آگے بڑھائے لا رہا ہے۔ اسی قسم کی روایات ہیں جو آج بھی سرمایہ داری۔ زمینداری اور جاگیرداری کی تائید میں بڑھ چڑھ کر پیش کی جاتی ہیں۔ اور جب کوئی یہ کہے کہ یہ چیزیں قرآن کے خلاف ہیں تو اسے یہ کہہ کر چپ کرا دیا جاتا ہے کہ تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا رسول اللہؐ اور صحابہؓ کبار زیادہ سمجھتے تھے!

(۰)

چونکہ اس مقالہ میں پوری تاریخ کا استقصاء مقصود نہیں اس لئے ہم انہی مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ آپ ان واقعات کو پھر سے سامنے لائیے جو خلیفہ اوّل کے انتخاب کے ضمن میں ہماری کتبِ احادیث و آثار میں بیان ہوئے ہیں اور پھر سوچئے کہ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو دنیا میں اسلام اور متبعینِ اسلام کی پوزیشن کیا رہ جاتی ہے؟

پس چہ باید کرد؟

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ اس کا جواب آسان ہے یعنی:-

(۱) ہمارا ایمان ہے کہ قرآنِ کریم خدا کی کتاب ہے جو حرفاً حرفاً اپنی حقیقی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔

(۲) رسول اللہؐ اور آپؐ کے صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ لہٰذا

(۳) اگر اس دور کی تاریخ میں ہمیں کوئی بات ایسی ملے جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیئے کہ تاریخ کا وہ بیان غلط ہے۔ خواہ وہ حدیث کے کسی مجموعہ میں ہو، یا کسی اور کتاب میں۔

(۴) مندرجہ بالا اصول کی روشنی میں ہمیں قرنِ اوّل کی تاریخ کو از سرِ نو مرتب کرنا چاہیئے۔ اس تاریخ سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ اس دور میں قرآنِ کریم پر اس طرح عمل ہوا تھا۔

(۵) اس دور کے بعد قرآنی نظام باقی نہیں رہا تھا، اس لئے اس وقت سے آج تک کی تاریخ مسلمان قوم کی تاریخ ہے۔ یہ تاریخ نہ اسلام کی صحیح تعبیر کہلا سکتی ہے، نہ ہمارے لئے دلیل اور حجت بن سکتی۔ نہ ہی ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم ان لوگوں کی مدافعت میں اپنا وقت اور توانائیاں صرف کریں۔ جنہیں اسلاف کہا جاتا ہے ان کے متعلق ہم اس سے زیادہ ماننے کے مکلف نہیں کہ

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ (۲/۱۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جو گذر چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا نتیجہ ان کے لئے تھا۔ تم جو کچھ کرو گے اس کا نتیجہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے کیا کیا تھا؟

(۶) جہاں تک قرآنِ کریم کے سمجھنے کا تعلق ہے اسے ہر زمانہ میں براہِ راست سمجھا جا سکتا ہے۔ دین میں سند اور حجت قرآن ہے۔ اور یہی ہمارے لئے غلط اور صحیح، حق اور باطل کا معیار ہے۔ جو اس کے مطابق ہے وہ حق ہے جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے۔

جب تک ہم اس مسلک پر عمل پیرا نہیں ہوتے، دین ہمارے سامنے نہیں آ سکتا۔

(-)

تکملہ:- یہ مقالہ آج سے قریب بائیس سال پہلے کا نوشتہ ہے۔ اسے اس موقعہ پر دوبارہ شائع کرنے کا ایک خاص مقصد ہے۔ آج کل ہمارے ہاں "اسلامی نظام" کا خاص چرچا ہے اور اس موضوع پر بڑی کثرت سے لکھا اور کہا جا رہا ہے۔ ان میں سے ہر محقق کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ اسلامی نظام کا جو نقشہ صدرِ اوّل میں قائم ہوا تھا، ہمیں اسی قسم کا نظام اپنے ہاں قائم کرنا چاہیئے۔ اس کے لئے ہر ایک، اپنے اپنے نقشہ کی تائید میں تاریخی شواہد

پیش کرتا ہے، اور چونکہ ان نقشوں میں باہمی اختلاف ہوتا ہے اس لئے ملک میں عجیب قسم کا ذہنی انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ اندریں حالات ہم نے مناسب سمجھا کہ صدرِ اوّل کی جو تاریخ ہم تک پہنچی ہے اس کی ایک خفیف سی جھلک قوم کے سامنے لائی جائے تاکہ اسے اندازہ ہو جائے کہ روایات کی طرح تاریخ بھی یقینی ذریعہ علم نہیں۔

یاد رکھئے! دین کے متعلق یقینی اور مبنی بر حقیقت علم، خدا کی کتاب (قرآنِ مجید) کے اندر محفوظ ہے جس میں ایک حرف کا بھی تغیر و تبدّل نہیں ہوا۔ اس لئے وہی نظریہ، عقیدہ، مسلک قانون یا نظامِ اسلامی کہلا سکتا ہے جس کی سند قرآن سے حاصل ہو۔

حق وہی ہے جو قرآن کے مطابق ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ باطل ہے خواہ اس کی نسبت کسی کی طرف کیوں نہ کر دی جائے۔ اس مقالہ میں بھی جو تاریخی بیانات قرآن کے خلاف ہیں، انہیں ہم وضعی قرار دیتے ہیں۔

(۰)

پرویز صاحب کی شہرۂ آفاق کتابیں جن سے صحیح اسلام سمجھ میں آ سکتا ہے

مفہوم القرآن

قرآن مجید مروجہ ترجموں اور عام تفسیروں سے سمجھ میں نہیں آ سکتا، یہ اس طرح سمجھ میں آ سکتا ہے کہ عربی مبین کی مستند کتب لغت کی رُو سے اس کے الفاظ کے معانی متعین کئے جائیں اور ایک مضمون سے متعلق مختلف آیات کو سامنے رکھ کر اس کا مفہوم مرتب کیا جائے۔ مفکرِ قرآن پرویز صاحب نے پورے قرآن کا مفہوم اسی انداز سے مرتب کیا ہے جو مفہوم القرآن کے نام سے (مع متن) عمدہ دبیز کاغذ پر تین مطلا جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ قیمت:- فی جلد ۵۰/- روپے
مکمل سیٹ ۳ جلد ۱۵۰/- روپے

لغات القرآن

یہ قرآنی الفاظ کی صرف ڈکشنری نہیں، یہ ان کا مستند اور واضح مفہوم پیش کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتاتی ہے کہ ان الفاظ سے قرآن کریم کس قسم کا تصور پیش کرتا ہے، اس کی تعلیم کیا ہے، اس کی دعوت کیا ہے۔ قرآن مجید نے انسان کو کیا دیا ہے۔ یہ اس کا کیا مقام متعین کرتا ہے چار جلدوں کی یہ کتاب قرآنی حقائق اور علوم حاضرہ کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ میں عمدہ سفید کاغذ پر چھپی ہے۔ قیمت:- فی جلد ۴۰/- روپے
مکمل سیٹ ۱۵۰/- روپے

ملنے کا پتہ

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام بی ۲۵ گلبرگ ۲ لاہور (۲) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک

(جسے معلوماتِ عامہ کے لئے وقتاً فوقتاً شائع کیا جاتا ہے۔)

(۱) تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کر سکتی۔ اسے اپنے رہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

(۲) خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے ابد تک ضابطۂ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آ سکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضورؐ رسالتمآب خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

(۳) قرآنِ کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآنِ کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابعِ تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے

(۴) کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

نبی اکرمؐ کی سیرتِ مقدسہ، شرف و عظمتِ انسانیت کی معراجِ کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کا جو حصہ قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے۔ سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضورؐ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضورؐ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہیئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرتِ مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہیئے۔

(۵) دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظامِ مملکت کی رو سے ہو سکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظامِ زندگی کا نام ہے) ممکن نہیں ہو سکتا۔

(۶) رسول اللہؐ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآنِ کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امورِ مملکت اُمت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

(۷) رسول اللہؐ کے بعد دین کا وہی نظام حضورؐ کے خلفائے راشدین نے جاری رکھا۔ اس میں امورِ مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو رسول اللہؐ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآنِ کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآنِ کریم نے

صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر اُمت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔

(۸) بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہوگیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے اُمت میں انتشار پیدا ہوگیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن اب مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہوگئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

(۹) ہمارے لئے کام کرنے کا یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو اُمت کو احکام قوانینِ خداوندی کے مطابق چلائے۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

(۱۰) چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کیلئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہمد گر مدغم ہو جائیں گے۔

(۱۱) جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا، اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز، روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں، کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کرکے اُسے "خدا اور رسول" کا طریقہ قرار دے۔

(۱۲) قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی، روٹی، کپڑا، مکان، علاج، تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

(۱۳) قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

(۱۴) جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآنِ کریم کے مطابق ہو، یا جس سے حضور نبی اکرمؐ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

(۱۵) ہم، رسول اللہؐ کے بعد، ہر قسم کے مدعیٔ وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

(۱۶) طلوعِ اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقۂ اہلِ قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)۔ نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ اُمت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز، روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں، ہم ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں کرتے۔ اور بلا ردّ و بدل ان کی پابندی کرتے ہیں۔ ہم قرآنِ کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاجِ رسالت) کا قیام عمل میں آسکے۔ یہ ہے ہمارا مسلک جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آرہے ہیں۔ اس کے خلاف جو کچھ ہماری طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ مخالفین کا گمراہ کن پروپیگنڈہ ہے۔

(۰)

سربستہ حقیقتیں بے نقاب — اسرار و رموز واشگاف

پرویز صاحب متعارف تو مفکرِ قرآن کی حیثیت سے ہیں، لیکن بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ کون کونسی ہوش رُبا وادیوں اور حیرت فروش منزلوں سے گذر کر اس چشمۂ نور و حیات تک پہنچے ہیں۔ ان کا بچپن، تصوّف کے خواب آور گہوارہ میں گذرا۔ جب ان کے شعور نے آنکھ کھولی تو ان کے دل میں خلش پیدا ہوئی کہ معلوم کیا جائے کہ تصوّف کی اصل و بنیاد کیا ہے۔ جسے مشاہدۂ حقیقت کہا جاتا ہے اس کی کُنہ و ماہیّت کیا ہے۔ واردات قلبی کا سرچشمہ کونسا ہے۔ مختلف ریاضتوں اور مراقبوں سے جو "وارداتِ" حاصل ہوتی ہے اس کی نوعیت کیا ہے۔ تعویذوں اور گنڈوں میں اثر کیسے پیدا ہوتا ہے۔ کرامات کس طرح سرزد ہوتی ہیں۔ یہ، اور اسی قسم کے سینکڑوں سوالات ان کے سینے میں اُبھرے جن کے حل کی تلاش میں وہ برسوں صوفیائے کرام کی درگاہوں اور خانقاہوں۔ ہندو سادھوؤں کی سمادھیوں اور سنیاسیوں کے یوگ آشرموں میں سرگرداں رہے اور اس طرح جو کچھ پڑھا تھا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جو کچھ سنا تھا اس کا ذاتی مشاہدہ کر لیا۔ ان واردات و مکاشفات کا علم و تجربہ حاصل کرنے کے بعد وہ دانشِ نورانی (کتاب اللہ) کے سنگِ آستاں پر سجدہ ریز ہوئے۔

اب انہوں نے اپنی ان آستاں نوردیوں اور خانقاہ پیمائیوں کی سرگذشت اور خود تصوّف کی تاریخ کو اپنے مخصوص دلآویز انداز میں، اپنی تازہ ترین تصنیف۔

تصوّف کی حقیقت

میں منضبط کر دیا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں — اوّل، تصوّف اور اسلام — دوم، تصوّف اور اقبالؒ — مستور حقیقتوں کا آئینہ، اور سربستہ رموز و اسرار کا گنجینہ — کتابت، طباعت کاغذ عمدہ — جلد مزیّن اور مطلّا — ضخامت چار سو صفحات سے زائد۔ قیمت -/۷۵ روپے (محصول ڈاک -/۵ ″)

ملنے کا پتہ:

(۱) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی، گلبرگ ۲ لاہور ۱۱ (۲) مکتبۂ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن

جیسے مقامی بزم ہائے طلوعِ اسلام کے اہتمام سے ہفتہ وار یا ماہانہ، کیسٹ یا ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے حسبِ ذیل مقامات اور اوقات پر باقاعدگی کے ساتھ نشر کیا جاتا ہے:۔

نام بزم طلوعِ اسلام	دن اور وقت	مقامِ درس کے کوائف :۔	نوٹ :۔ پرویز صاحب کے درس کے دوران ہی متعدد کیسٹیں اور ٹیپس بزموں کے لئے ریکارڈ کر لئے جاتے ہیں
لاہور	جمعہ ۹ بجے صبح	۲۵/بی گلبرگ ۲ (نزد پولیس سٹیشن) فون نمبر ۸۰۰۸۸	
لندن (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۲ بجے دوپہر	149 SUTTON COURT RD. LONDON (E-13-9NR) PHONE-01-552-1517	
برمنگھم (انگلینڈ)	ہر ماہ کا پہلا اتوار دو بجے دوپہر	(بمقام) 60, HERICK RD SALTLEY, B8 INT.	
اوسلو (ناروے)	ہر ماہ کا پہلا اتوار شام ۶ بجے	(بمقام) MR MANZOOR AHMAD, DOVRE GATE-7/OSLO-I	
ٹورنٹو (کینیڈا)	ہر ماہ کا پہلا اتوار ۱۰ بجے صبح	335 DRIFTWOOD AVE - #311, DOWNS VIEW. TORONTO (NORTH YORK) (ONT): M3N-2P3. PHONE (416) 661-2827	
کراچی ۲	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	کتب خانہ بزم طلوعِ اسلام کمرہ ۲۴ ہارون چیمبرز، الطاف حسین روڈ نیو چالی۔ فون ۲۳۸۸۲۸	
پشاور (۱)	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ آغا محمد یونس صاحب۔ رفیق لین صدر (OPP: VIP MAINGATE) پشاور سٹیڈیم	
پشاور (۲)	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ہوٹل نعمت کدہ۔ یونیورسٹی روڈ۔ جہانگیر آباد۔ فون ۴۰۶۹۲	
مردان	ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح	عبداللطیف۔ محمود علی صاحب۔ آکا خیل بلڈنگ نواب علی روڈ	
راولپنڈی	ہر جمعہ ۵ بجے شام	جی - ۱۶۶ لیاقت روڈ	
لیہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	شبیر ٹیکنیکل انجینئرنگ ورکس۔ شہید روڈ (لیہ)	
ایبٹ آباد	ہر جمعہ ۴ بجے شام	رہائش گاہ صلاح الدین صاحب واقع 234-K-L کہپال (ایبٹ آباد)	
سرگودھا	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	چوک دار سیلائی مکان نمبر ۵۔ نظامی منزل	
بہاولپور	ہر جمعہ ۸ بجے صبح	عثمانی خیراتی شفاخانہ۔ غنی پورہ باہتمام ڈاکٹر ہومیو محمد اعظم خان صاحب۔	
چکوال	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	ضیا ٹیوشن سنٹر، نزد ہجویری مسجد، باہتمام ماسٹر غلام حسین صاحب نمائندہ بزم طلوعِ اسلام۔	
کوئٹہ	باقاعدہ ہفتہ وار	رابطہ کے لئے۔ پیڈیو اینڈ الیکٹرک سنٹر توغی روڈ۔ باہتمام غلام صابر صاحب	
گوجرانوالہ	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم ملحق رہائش گاہ :۔ چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ، سول لائنز	
گجرات	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ و ہر اتوار ۴ بجے سہ پہر	بمقام ۱/۱۴ اے بی ملک پورہ روڈ۔ باہتمام شیخ قدرت اللہ صاحب ایڈووکیٹ	
جلالپور جٹاں	ہر جمعہ بعد نماز جمعہ	دفتر بزم طلوعِ اسلام (بازار کلاں)	
ملتان	ہر جمعہ ۹ بجے صبح	دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ (فون ۷۱۰۰۰۰۳۱)	
پنجکسی (تحصیل کبیر والا ملتان)	ہر جمعہ ۳ بجے سہ پہر	بمقام۔ مطب حکیم احمد الدین صاحب (نمائندہ بزم)	
بنگو	ہر جمعہ ۵ بجے شام	رہائش گاہ محمد جمیل صاحب واقع ریلوے روڈ (فون نمبر ۶۱)	
فیصل آباد	ہر جمعہ ۳ بجے بعد دوپہر	بمقام۔ حیات سرجری کلینک ۲۳/۲ پیپلز کالونی ۲ (فون ۴۲۸۵۵)	

میں تجھ کو بتاتا ہوں

تقدیرِ اُمم

کیا ہے!

پرویز

(رگاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را)

(آجکل آپ کو اہلِ پاکستان کی زبان سے اس قسم کے الفاظ عام طور پر سنائی دیں گے ...... ہمارا حشر کیا ہوگا؛ اس قوم کا انجام کیا ہوگا؛ ہر حیثیت سے بگڑے ہوئے معاشرہ کی اصلاح کی کوئی صورت ہو سکے گی یا نہیں؛ حتیٰ کہ یہ ملک بچ بھی سکے گا یا نہیں؛ ظاہر ہے کہ یہ کیفیت انتہائی مایوسی کی عکاس ہے، اور قوموں کی زندگی میں مایوسی، ان کی تباہی کی علامت! یہ الفاظ تو آپ ہر ایک کی زبان سے سنیں گے لیکن اس کے اسباب وعلل کے متعلق آپ کے سامنے مختلف خیالات آئیں گے۔ ان لوگوں کو چھوڑ کر جو ایسے وقت میں "خدا کی مرضی" یا "ہماری تقدیر" کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتے اور اس طرح خواب آور گولیوں سے خودکشی کر لیتے ہیں، ان لوگوں کی طرف آجائیے جو حالات کا تجزیہ کرنے کا دعویٰ کرتے اور لمبی چوڑی بحثوں میں اُلجھے رہتے ہیں، تو آپ دیکھیں گے کہ ان کی بات بھی چند ہنگامی حوادث، اتفاقی حادثات یا سیاسی تغیرات سے آگے نہیں بڑھتی —— اور ان کی بنیاد باہمی الزام تراشیوں کے سوا کچھ نہیں ہوتی —— یعنی یہ کہ یہ سارا بگاڑ فریقِ مقابل کا پیدا کردہ ہے۔ لیکن طلوعِ اسلام تو ہر معاملہ کے لئے قرآنِ کریم کی بارگاہ سے راہ نمائی طلب کرتا ہے۔ وہ قوموں کے عروج وزوال کے اسباب کیا بتاتا ہے، اور ان کی موت وحیات سے متعلق قوانین کی صراحت کس طرح سے کرتا ہے، اس باب میں ہم شروع سے لکھتے چلے آرہے ہیں۔ لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ ان حقائق کو بار بار قوم کے سامنے لایا جائے تاکہ اس کی توجہ ہنگامی اسباب وعلل سے ہٹ کر بنیادی اور اساسی وجوہات کی طرف منتقل ہو، اور وہ اس طرح اس آنے والی تباہی سے بچ جانے کی صحیح تدبیر کر سکے۔ قرآن ہمیں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ ؂

صورت گری راز من بیاموز — شاید کہ خود را باز آفرینی

(طلوعِ اسلام)

—— (۰) ——

قرآنِ کریم نے خدا کا جو تصوّر دیا ہے اس کی رُو سے اس نے ایسے قوانین متعین کر دیئے ہیں جن کے مطابق کائنات کا یہ عظیم سلسلہ سرگرمِ عمل ہے۔ اسی قسم کے قوانین اس نے انسانی دنیا کے لئے بھی مقرر کر رکھے ہیں۔ انسانی دنیا میں ایک تو افراد کی زندگی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق ایک فرد کی طبیعی زندگی اور اس کی ذات کی نشو و نما دونوں پر ہوتا ہے لیکن اس سے کہیں اہم اقوام کی زندگی ہے۔

قوم اگرچہ افراد ہی کے مجموعے کا نام ہوتا ہے لیکن اس کی نفسیات منفرد اور مختص ہوتی ہیں۔ قرآن کریم نے وہ قوانین بھی دیئے ہیں جن کے مطابق قوموں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر ایک قوم خدا کے متعین کردہ قوانین کے مطابق زندگی بسر کرتی ہے۔ یعنی وہ ایسا نظام اور معاشرہ متشکل کرتی ہے جس کی بنیادیں خدا کے مقرر کردہ قوانین پر استوار ہوں، تو اس قوم کو سرفرازیاں اور سربلندیاں نصیب ہوتی ہیں۔ اور اگر وہ ان قوانین کی خلاف ورزی کرے تو وہ تباہ اور برباد ہو جاتی ہے۔ اس کا نام اجتماعی قانونِ مکافاتِ عمل ہے، اور یہ اسی طرح اٹل اور غیر متبدّل ہے جس طرح افراد کے لئے قانونِ مکافات۔ قرآن کی رُو سے تاریخ اسی اجتماعی قانونِ مکافات کے ریکارڈ کا نام ہے۔ یعنی وہ یہ بتاتی ہے کہ فلاں قوم نے فلاں نظریۂ زندگی کے مطابق معاشرہ قائم کیا تو اس کا یہ انجام ہوا۔ اور فلاں قوم نے فلاں تصوّرِ حیات کے مطابق زندگی بسر کی تو اس کا مآل یہ ہوا۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے "سائنس آف ہسٹری" یا "فلاسفی آف ہسٹری" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

تاریخ کی اہمیت

قرآن تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے اتنی اہمیت کہ وہ تاریخ کو اپنے دعاوی کی صداقت کے لئے بطور شہادت پیش کرتا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ جب ہم نے کہا ہے کہ جو قوم اس انداز کی زندگی بسر کرے گی وہ تباہ و برباد ہو جائے گی تو اس دعوے کی صداقت کا ثبوت یہ ہے کہ تم تاریخِ انسانیت پر غور کرو اور دیکھو کہ جس جس قوم نے جس جس ملک اور جس جس زمانے میں یہ روش اختیار کی، اس کا انجام تباہی اور بربادی ہوا یا نہیں؟ قرآنی دعاوی (یا خدا کے اٹل قوانین) کے پرکھنے کے لئے یہ ایک ایسا معیار ہے جو ساری دنیا کے لئے کھلا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے متبعین کو خاص طور پر تاکید کی ہے کہ وہ تاریخ کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو قرآنی دعاوی کی صداقت کے شواہد ان کے سامنے آتے رہیں گے اور دوسرے وہ اس بات کا اندازہ کرتے رہیں گے... کہ ان کا کوئی قدم غلط راستے کی طرف تو نہیں اُٹھ رہا۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ ہم نے تمہاری راہنمائی کے لئے قرآن میں دو چیزیں دی ہیں۔ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ...... (۲۴/۳۴) یعنی ایک تو وہ واضح قوانین جن کے مطابق قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں اور دوسرے اقوامِ سابقہ کے احوال و کوائف (تاریخ) جن سے ان قوانین کی صداقت پرکھی جا سکتی ہے۔

قرآن اور تاریخ

آپ قرآن کو دیکھئے۔ اس میں اقوامِ سابقہ کے احوال و مآل اس تفصیل و تکرار سے دیئے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ تاریخ کی کتاب ہے۔ لیکن وہ تاریخ کی کتاب نہیں۔ اس کا انداز یہ ہے کہ وہ پہلے ان قوانین کو بیان کرتا ہے جو قوموں کے عروج و زوال کے اسباب متعین کرتے ہیں۔ اور اس کے بعد اقوامِ گذشتہ کے حالات سامنے لا کر یہ بتاتا ہے کہ دیکھو ان قوانین نے اپنا اٹل نتیجہ کس طرح مرتب کیا۔ اور پھر اس سے توجہ فوراً

اس طرف میذول کرا دیتا ہے کہ اگر تم نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کی تو تمہارا انجام بھی ایسا ہی ہوگا۔ وہ قرآن کے نظامِ حق و صداقت کے مخالفین کے متعلق کہتا ہے کہ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا..... کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ۝ (۴۰/۸۲) "کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں کہ یہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گذری ہیں، اور انہوں نے ان کی طرح غلط روش اختیار کی تھی، ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں، ان کی عظمتِ گذشتہ کی داستانیں پکار پکار کر دہرا رہی ہیں۔ وہ قومیں تعداد میں بھی ان سے زیادہ تھیں (جو اب اس نظام کی مخالفت کر رہے ہیں) اور قوت میں بھی بڑھ کر۔ ان کی قوت و شوکت کے جھنڈے زمین میں گھڑے ہوئے تھے۔ لیکن جب ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ ان پر یہ تباہی اچانک نہیں آگئی تھی۔ خدا نے پہلے ان کی طرف اپنے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں تنبیہ کر دیں ——— (WARNING) دے دیں کہ جس راستے پر تم چل رہے ہو وہ تمہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ..... کَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (۴۰/۸۳) "لیکن جب خدا کے پیغمبر ان کی طرف ایسے واضح دلائل لے کر آئے تو انہوں نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ ہم جس طریق پر چلے جا رہے ہیں، اس سے مطمئن ہیں۔ وہ ہمیں مسرتوں کے جھولے جھلا رہا ہے۔ تم خواہ مخواہ کہہ رہے ہو کہ ہم پر تباہیاں آ رہی ہیں۔ لیکن آخر الامر انہیں اس تباہی نے آگھیرا جس کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (۴۰/۸۴) "جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو اس وقت کہنے لگے کہ ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور جن قوتوں کو ہم اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے ان سے انکار کرتے ہیں"۔ لیکن "فَلَمْ یَكُ..... بَاْسَنَا..... (۴۰/۸۵) جب غلط روش کے نتائج مرتب ہو کر سامنے آجائیں تو اس وقت اس سے اجتناب کرنا کچھ فائدہ نہیں دے سکتا"۔ اور یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہ تھی جو صرف انہی کے ساتھ مختص تھی۔ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِیْ..... الْكٰفِرُوْنَ۔ (۴۰/۸۵) "یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس کے مطابق تمام اقوام سابقہ کی موت و حیات کے فیصلے ہوئے ہیں اور یہی وہ مقام ہے جہاں حق و صداقت کی روش سے انکار کرنے والے نقصان میں رہتے ہیں"۔

دوسرے مقام پر ہے۔ وَكَمْ..... قَوْمًا اٰخَرِیْنَ۔ (۲۱/۱۱) "کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جنہوں نے ظلم و استبداد کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ ہم نے انہیں (ان کی غلط روش کے نتیجے میں) ہلاک کر دیا۔ اور ان کی جگہ دوسری قوم لے آئے"۔ اُس (تباہ ہونے والی قوم) کی حالت یہ تھی کہ انہیں ان کی غلط روش کے نتائج سے ہزار آگاہ کیا گیا، لیکن انہوں نے ایک نہ سُنی۔ لیکن فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَرْكُضُوْنَ (۲۱/۱۲) "جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھ لیا تو اس سے بھاگنے لگے۔ لیکن ہمارے

قانونِ مکافات کی گرفت

قانونِ مکافات نے انہیں للکار کر کہا کہ لَا تَرْكُضُوْا "بھاگو نہیں"۔ تم بھاگ کر جا کہاں سکتے ہو؟ وَارْجِعُوْٓا..... تُسْـَٔلُوْنَ۔ (۲۱/۱۳) "چلو واپس اپنے محلات کی طرف اور اس ساز و یراق کی طرف جو تمہارے لئے اس قدر آسائشیں بہم پہنچاتا تھا۔ واپس

چلو تاکہ تم سے پوچھا جائے کہ اتنا مال و دولت تم نے کہاں سے لیا تھا، وہ مظلوم کون تھے جن کے خونِ ناحق کی رنگینی تمہارے محلات کے لئے وجہِ آرائش بنی تھی"۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَآ اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ۔ (۲۱/۱۴) "اس پر وہ پکار اٹھے کہ ہم واقعی بہت ظلم و ستم کیا کرتے تھے۔ یہ تمام ساز و سامان اسی ظلم و ستم کا نتیجہ ہے۔ فَمَا زَالَتْ..... خٰمِدِيْنَ (۲۱/۱۵) " وہ یہی پکارتے رہے لیکن ان کی اس وقت کی پکار انہیں کچھ فائدہ نہ دے سکی۔ خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل نے انہیں ایسا کر دیا جیسے کٹے ہوئے کھیت (اور) بجھے ہوئے شعلے ہوں۔

مذکورہ بالا آیت (۲۱/۱۲) میں کہا گیا ہے کہ فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ۔ "جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں سامنے دیکھا۔ جب انہیں اس کا احساس ہوا"۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ غلط نظامِ تمدن و معاشرت اپنے تباہ کن نتائج تو روزِ اول ہی سے مرتب کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن وہ اثرات بڑے غیر محسوس ہوتے ہیں اور انہیں صرف وہی آنکھ دیکھ سکتی ہے جس پر مفاد پرستیوں کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہ نتائج اندر ہی اندر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ تا آنکہ ایک دن محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں۔ محسوس شکل میں سامنے آنے کے یہ معنی ہوئے کہ ان کی تباہی ایسے اسباب و ذرائع سے ہوتی ہے جو محسوس طور پر نظر آتے

تباہی کا اصل سبب

ہیں۔ لیکن یہ اسباب ان کے غلط نظام کے تباہ کرنے کا فقط ذریعہ (INSTRUMENT) ہوتے ہیں —— اس کا اصلی سبب (REAL CAUSE) تو ان کی غلط روشِ زندگی ہوتی ہے۔ وقائع نگار (جن کے نزدیک تاریخ فقط واقعات و حوادث کے ریکارڈ کا نام ہے) ان محسوس اسباب کو ان کی تباہی کا سبب قرار دیتے ہیں۔ لیکن قرآن، جو تاریخ کو ایک سائنس یا فلسفہ کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، ان واقعات و حوادث (یعنی ظاہری اسباب) کو چنداں اہمیت نہیں دیتا۔ وہ علاماتِ مرض کی بجائے علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا حقیقی سبب وہ تھا۔

آپ نے یہ بھی دیکھا ہے کہ قرآنِ کریم نے اس قانون کو جس کی رو سے قوموں کی موت و حیات کے فیصلے ہوتے ہیں "سنت اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ہیں "خدا کی عادت یا روش" اور اس سے مراد ہے وہ قانونِ مکافاتِ

سنت اللہ

عمل جو شروع سے یکساں چلا آ رہا ہے اور غیر متبدل ہے۔ فطرت کے تمام قوانین "سنت اللہ" ہیں، جن میں کبھی تغیر و تبدل نہیں ہوتا۔ سورۂ احزاب میں ہے ——

سُنَّةَ اللّٰهِ ...... قَدَرًا مَّقْدُوْرًا (۳۳/۳۸) " یہ اللہ کی عادت یا روش ان لوگوں کے متعلق تھی جو اس سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ اللہ کی عادت یا روش کیا؟ یہ اس کا فیصلہ ہے جو ایک اٹل قانون کی شکل اختیار کر چکا ہے"۔ اسی سورت میں آگے چل کر ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ ...... تَبْدِيْلًا۔ (۳۳/۶۱) "یہی قانونِ خداوندی ہے جس نے اقوامِ سابقہ کی تقدیروں کے فیصلے کئے تھے۔ تو قانونِ خداوندی میں کبھی تبدیلی نہیں پائے گا"۔ اسی طرح سورۂ فاطر میں اقوامِ سابقہ کے احوال و ظروف اور انجام و عواقب کے سلسلے میں کہا کہ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (۳۵/۴۳) " یہ لوگ جو اس نظامِ خداوندی کی مخالفت کر رہے ہیں، انہیں اس کے سوا کسی چیز کا انتظار نہیں کہ خدا کے جس قانون کے مطابق اقوامِ گذشتہ کے فیصلے ہوئے تھے اسی قانون کا ان پر بھی اطلاق ہو جائے"۔ سو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ خدا کا وہی قانون ان

پر بھی منطبق ہو کر رہے گا۔ اس لئے کہ لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيلًا ..... (۳۵/۴۳) "تو نہ تو خدا کے قانون میں کوئی تبدیلی پائے گا اور نہ ہی ایسی صورت ہو سکے گی کہ جب وہ قانون آجائے تو کوئی اُس کا رُخ کسی دوسری طرف پھیر دے۔"

ہیگل اور مارکس کا فلسفۂ تاریخ

ہمارے زمانے میں ہیگل (HEGEL) نے (اور اس کے تتبع میں مارکس (MARX) نے تاریخ کو ایک فلسفہ کی حیثیت سے پیش کیا۔ لیکن ان کا فلسفۂ تاریخ کیا ہے؟ ہیگل نے کہا کہ ایک تصوّر (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب شباب تک پہنچتا ہے تو اس میں انحطاط شروع ہو جاتا ہے اور ..... اس میں سے اس کی ضد ایک دوسرا تصور نمودار ہو جاتا ہے۔ اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے اور اس میں سے ایک اور تصوّر پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اس کی ضد ہوتا ہے۔ ساری تاریخ انہی متضاد تصوّرات کی کشمکش کی داستان ہے۔ مارکس نے بھی یہی کہا، اس تبدیلی کے ساتھ کہ یہ جنگ تصوّرات کی نہیں بلکہ نظام ہائے معیشت (ECONOMIC SYSTEMS) کی ہے۔ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ پھر اس میں سے اس کی ضد ایک اور نظام نمودار ہوتا ہے۔ جو پہلے نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ لے لیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ یہ سلسلۂ کشمکش اس ربط و نظم کے ساتھ کس قوت کی بنا پر جاری و ساری ہے تو اس نے کہا کہ یہ "روحِ زمانہ" (ZEITGEIST) کی کارفرمائی ہے۔ اور جب یہی سوال مارکس سے کیا گیا تو اُس نے کہا کہ اس کا سبب تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔

تاریخ کے اس فلسفہ کی رُو سے نہ کائنات کے سامنے کوئی مقصد اور منزلِ مقصود ہے۔ نہ کوئی تصوّر فی ذاتہٖ خیر یا شر ہے۔ نہ کسی تصوّر یا نظام میں آگے بڑھنے اور باقی رہنے کی صلاحیت ہے۔ نہ ہی اس تمام کارگہِ ہست و بود کے پیچھے کوئی ایسی قوت ہے جو اس عظیم سلسلہ کو کسی مقصد کے مطابق چلا رہی ہو۔ کچھ اندھی قوتیں ہیں جو میکانکی طور پر مصروفِ کشمکش ہیں۔ اور بے کس و بے بس انسان ان تضادات بے معنی اور تزاحماتِ بے مقصد میں خواہ مخواہ پستا چلا جا رہا ہے۔

قرآنی فلسفۂ تاریخ

لیکن قرآن نے جو فلسفۂ تاریخ پیش کیا ہے وہ اس سے یکسر مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کائنات میں حق اور باطل کی کشمکش پیہم جاری ہے۔ حق، اٹل، مستحکم اور غیر متبدّل ہے اور اس کا نتیجہ تعمیر و ارتقاء۔ اس کے برعکس، باطل مرغِ بادنما کی طرح ہر آن بدلنے والا ہے۔ اور اس کا نتیجہ تخریب و تنزل ہے۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں آخر الامر حق غالب آتا ہے۔ اس لئے کہ باطل پر غلبہ حاصل کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے۔ بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ ..... (۲۱/۱۸) "ہم حق کو باطل پر مارتے ہیں اور اس کی ضرب سے پیہم کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فَيَدْمَغُهُ۔ حق، باطل کا سر توڑ دیتا ہے۔ فَإِذَا هُوَ زَاهِقٌ ..... پس وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُونَ (۲۱/۱۸) "تم لوگ اس نظریہ کے خلاف جو کچھ بیان کرتے ہو، اس کا نتیجہ تباہی اور

بربادی کے سوا کچھ نہیں۔"

اب سوال یہ ہے کہ یہ کش مکش حق و باطل اور آخر الامر حق کا غلبہ اور باطل کی شکست، ہوتی کس مقصد کے لئے ہے؟ اور اس کے پیچھے کونسی قوت کارفرما ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ خدا نے یہ سلسلۂ کائنات بالمقصد پیدا کیا ہے۔ یونہی بیکار پیدا نہیں کیا۔ سورۂ الدخان میں ہے کہ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ ..... لٰعِبِيْنَ (۴۴/۳۸) "ہم نے کائنات کی بستیوں اور بلندیوں کو یونہی کھیلتے ہوئے پیدا نہیں کیا۔ مَا خَلَقْنٰهُمَآ ..... لَا يَعْلَمُوْنَ (۴۴/۳۹) "ہم نے اسے حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کا علم نہیں رکھتے اور سمجھتے ہیں کہ کائنات یونہی وجود میں آگئی ہے اور بالمقصد سرگرم عمل ہے۔" یہ تصور غلط ہے۔ کائنات کی تمام قوتیں اس لئے سرگرم عمل ہیں کہ ہر عمل اپنا صحیح صحیح نتیجہ مرتب کرے۔ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ ..... بِالْحُسْنٰى ..... (۵۳/۳۱) "تاکہ وہ ان لوگوں کو جو ناہمواریاں پیدا کرتے ہیں، ان کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ دکھائے۔ اور جو لوگ ہمواریاں اور خوشگواریاں پیدا کرتے ہیں انہیں اچھا بدلہ ملے۔"

چونکہ کائنات بالحق پیدا کی گئی ہے اس لئے ہر وہ تصور۔ ہر وہ عمل۔ ہر وہ نظامِ زندگی جو حق (مستقل اقدار) کے مطابق ہوگا وہ زندہ رہے گا، اور آگے بڑھے گا۔ جو اس کے خلاف جائے گا اور تعمیرِ انسانیت کے لئے مضر ہوگا وہ تباہ ہو جائے گا۔ اس مقام پر ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ظالموں کی کھیتی پنپتی ہے اور جو لوگ عدل و دیانت کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں، ان پر عرصۂ حیات تنگ ہو جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ یہی ہے۔ لیکن کسی تصورِ حیات، نظامِ زندگی یا اس تصور و نظام کی حامل قوم کی کیفیات کا مشاہدہ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کے

اقوام کی زندگی ماپنے کے پیمانے

کائناتی قوانین کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ سورۂ الحج میں ہے۔ وَيَسْتَعْجِلُوْنَكَ بِالْعَذَابِ ..... "یہ لوگ کہتے ہیں کہ جس تباہی اور بربادی سے انہیں ڈرایا جاتا ہے۔ وہ جلدی کیوں نہیں آتی۔ اگر ہماری روش غلط ہے تو ہم عذاب میں کیوں نہیں ماخوذ ہو جاتے؟" اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ وَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ وَعْدَهٗ ..... تم اس کا یقین رکھو کہ خدا کا قانونِ مکافاتِ اٹل ہے۔ اس میں کبھی خطا نہیں ہو سکتی۔ لیکن بات یہ ہے کہ اِنَّ يَوْمًا عِنْدَ ..... مِّمَّا تَعُدُّوْنَ ..... (۲۲/۴۷) "خدا کے قانونِ مکافات کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار سے ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ قومیں نہ ایک دن میں بنا کرتی ہیں، نہ ایک دن میں ختم ہو جاتی ہیں۔ ان کی زندگی اور موت کے پیمانے افراد کے پیمانوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا اگر کسی قوم کے غلط نظامِ معاشرت کا تباہ کن نتیجہ جلد سامنے نہیں آتا تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ ان کی اس غلط روش کا نتیجہ مرتب ہی نہیں ہو رہا۔ میزانِ کائنات میں ان کے ہر عمل کا ذرہ ذرہ تلتا

ہے۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ ..... شَرًّا يَّرَهٗ ..... (۹۹/۷-۸) "جو ایک ذرّہ کے برابر بھی ٹھیک کام کرتا ہے اس کا نتیجہ بھی سامنے آجائے گا۔ جو ایک ذرّہ کے برابر غلط کام کرتا ہے، وہ اسے بھی دیکھ لے گا۔" یہاں

میزانِ عمل ہر وقت موجود رہتی ہے

کوئی عمل، نتیجہ مرتب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن افراد کی طرح اقوام کی صحت اور بیماری (اور زندگی اور موت) کا اصول یہ ہے کہ جب تک اچھے کاموں کا پلڑا جھکا رہتا ہے قوم زندہ رہتی ہے اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب غلط کاموں کا پلڑا جھک جاتا ہے تو قوم کا تنزل شروع ہو جاتا ہے۔ فَاَمَّا مَنْ ..... هَاوِيَةٌ ..... (۱۰۱/۶-۹) اس لئے کہ تعمیری امور، تخریبی امور کے نقصان رساں اثرات کو ساتھ کے ساتھ زائل کرتے رہتے ہیں۔ اِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ..... (۱۱/۱۱۴) اس کے برعکس اگر تخریبی امور کا پلڑا جھکنا چلا جائے تو وہ قوم آہستہ آہستہ، بتدریج ہلاکت کے جہنّم کی طرف بڑھتی چلی جاتی ہے، ایسے غیر محسوس انداز سے کہ انہیں پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم تباہی کی جانب کشاں کشاں چلے جا رہے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ (۶۸/۴۴) "ہم انہیں بتدریج اس طریق سے پکڑتے ہیں جس کا انہیں علم بھی نہیں ہوتا۔" اگر وہ قوم اپنی ہلاکت سے پہلے اپنی روش کی اصلاح کر لے، اور اس کی جگہ صحیح طریق زندگی اختیار کر لے تو وہ تباہی سے بچ جاتی ہے لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتی اور تباہی کے جہنّم تک پہنچ جاتی ہے تو پھر اس کے لئے بازآفرینی کا کوئی موقع نہیں رہتا۔ وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ ..... يَرْجِعُوْنَ (۲۱/۹۵) اور وہ اس طرح ہلاک ہوتی ہے کہ فَمَا بَكَتْ ..... مُنْظَرِيْنَ (۴۴/۲۹) کہ ان کی تباہی پر نہ آسمان روتا ہے، نہ زمین۔ اور نہ ہی انہیں مہلت دی جاتی ہے۔

جس طرح افراد کی طبیعی زندگی سے متعلق بیماریاں مختلف ہوتی ہیں اسی طرح اقوام کے نظام ہائے تمدّن و معیشت کی خرابیاں بھی متنوّع ہوتی ہیں۔ پھر جس طرح ہر مرض اور اس کی وجہ سے آنے والی موت کا درمیانی عرصہ مختلف ہوتا ہے۔ تپ دق سے مریض برسوں میں گھل گھل کر مرتا ہے لیکن گردن توڑ بخار چند دنوں کی بھی مہلت نہیں دیتا۔ اسی طرح نظام ہائے تمدّن و معیشت کی خرابی اور اس کی وجہ سے

اجل کا مفہوم

آنے والی ہلاکت میں بھی مہلت کا وقفہ مختلف ہوتا ہے۔ اس مہلت کے وقفہ کی آخری حد کو قرآن کی اصطلاح میں اجل کہتے ہیں۔ سورۂ یونس میں ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ ..... لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ مُوْتَ ..... (۱۰/۴۹، ۲۳/۴۳) "ہر قوم کے لئے ایک اجل ہوتی ہے۔ اس وقت سے پہلے پہلے تو ان کے لئے اصلاحِ احوال کی گنجائش ہوتی ہے لیکن جب وہ آخری وقت آجاتا ہے تو اس میں ایک گھڑی کا تقدّم و تاخّر بھی نہیں ہو سکتا۔" اس لئے کہ (طبیعی امراض کی طرح) اجتماعی زندگی اور موت کے لئے بھی اٹل قانون مقرر ہے، اور یہ سب کچھ اس قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ..... "ہر قوم یا ہر نظام کے لئے ایک اجل ہوتی ہے" تو دوسری جگہ یہ کہہ کر اس کی وضاحت کر دی کہ لِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ ..... (۱۳/۳۸) "ہر اجل کے لئے ایک

قانون مقرر ہے" قوموں کا محو و ثبات اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ یَمۡحُوا اللّٰہُ ..... وَیُثۡبِتُ ..
"اور یہ سب کچھ خدا کی اس مشیئت کے مطابق ہوتا ہے جس کی رو سے افراد اور اقوام کی موت اور زندگی کے لئے قوانین مرتب ہیں" وَعِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ ..... (۱۳/۳۹) "قانون کی اصل و بنیاد اس کے پاس ہے"۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم کی رو سے قوموں کی موت و حیات نہ یونہی ہنگامی اور اتفاقی طور پر واقع ہوتی ہے اور نہ ہی "فطرت کی کسی اندھی قوت" کی رو سے، محض دھاندلی سے۔ یہ سب کچھ قاعدے اور قانون کے مطابق

موت و حیات علیٰ بصیرت

ہوتا ہے۔ لِّیَہۡلِکَ ..... عَنۡۢ بَیِّنَۃٍ ..... (۸/۴۲) تاکہ جو ہلاک ہو وہ بھی دلیل اور برہان کی رو سے ہلاک ہو، اور جو زندہ رہے وہ بھی دلیل اور برہان کی رو سے زندہ رہے" یہاں نہ زندگی بخشش کے طور پر ملتی ہے، نہ ہلاکت اور تباہی دھاندلی سے ہوتی ہے۔ وَمَا کَانَ اللّٰہُ ..... یَظۡلِمُوۡنَ (۲۹/۴۰) "خدا کسی قوم پر ظلم نہیں کرتا۔ وہ قوم خود اپنے آپ پر ظلم کرتی ہے" اور اسی وجہ سے تباہ ہو جاتی ہے۔ خدا کو (معاذ اللہ) کسی پر ظلم کرکے لذت نہیں ملتی۔ کہ وہ دوسروں کو عذاب میں مبتلا کرکے ان کے تڑپنے اور پھڑکنے کا تماشہ دیکھے) وہ کہتا ہے کہ مَا یَفۡعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمۡ اِنۡ شَکَرۡتُمۡ وَاٰمَنۡتُمۡ ..... (۴/۱۴۷) "اگر تم خدا کے مقرر کردہ اصولوں پر قائم رہو اور زندگی کے محاسن کی قدر کرو، تو اللہ نے تمہیں عذاب دے کر کیا کرنا ہے" جو قوم یہ سمجھتی ہے کہ رَبِّیۡۤ اَھَانَنِ ..... (۸۹/۱۶) "خدا نے ہمیں یونہی، بے جرم و خطا ذلیل کر دیا" وہ ان سے للکار کر کہتا ہے کہ کَلَّا ـــ ہرگز نہیں۔ تم غلط کہتے ہو۔ خدا نے بلا وجہ تمہیں ذلیل نہیں کر دیا۔ بَلۡ لَّا تُکۡرِمُوۡنَ الۡیَتِیۡمَ ....

خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا

(۸۹/۱۷) "تمہاری حالت یہ تھی کہ تم کسی ایسے انسان کی عزت نہیں کرتے تھے جو معاشرے میں تنہا رہ جاتے" وَلَا تَحٰٓضُّوۡنَ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ ۙ (۸۹/۱۸) "نہ تم ایک دوسرے کو ترغیب دیتے تھے کہ جس کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے اس کی روٹی کا انتظام کرنا چاہیئے" اس کے برعکس تمہاری حالت یہ تھی کہ وَتَاۡکُلُوۡنَ التُّرَاثَ اَکۡلًا لَّمًّا ..... (۸۹/۱۹) "تم باپ دادا سے ملی ہوئی دولت کو سمیٹ کر خود ہی کھا جاتے تھے" وَّتُحِبُّوۡنَ الۡمَالَ حُبًّا جَمًّا .... (۸۹/۲۰) اور دولت سے اس قدر محبت کرتے تھے کہ چاہتے تھے کہ دوسروں کا مال و متاع بھی تمہارے قبضے میں آ جائے" تم نے اس قسم کا نظام قائم کر رکھا تھا، جس کا لازمی نتیجہ تمہاری ذلت و خواری تھی۔ یہ وجہ تھی کہ تم ذلیل ہو گئے۔ خدا نے تمہیں یونہی، بلا وجہ ذلیل نہیں کر دیا۔ خدا ایسا قطعاً نہیں کیا کرتا۔ جب تک کوئی قوم صلاحیت بخش نظام پر کاربند رہتی ہے، ہلاکت سے محفوظ رہتی ہے۔ وَمَا کَانَ رَبُّکَ .... مُصۡلِحُوۡنَ (۱۱/۱۱۷) ہلاکت انہی کی ہوتی ہے جو صحیح قالب چھوڑ کر اپنے لئے غلط پیکر اختیار کر لیتے ہیں۔ فَہَلۡ یُہۡلَکُ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡفٰسِقُوۡنَ۔ (۴۶/۳۵)

سوال یہ ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے مراد کیا ہے؟ اس سے یہ مراد نہیں کہ اس قوم کا ایک ایک فرد

موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے اور اس طرح اس کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے۔ اس

ہلاکتِ اُمم سے کیا مراد ہے؟

میں شبہ نہیں کہ انسانی زندگی کے ابتدائی ادوار میں ایسا بھی ہوتا تھا کہ پوری کی پوری قوم طبیعی طور پر تباہ ہو جاتی تھی، اور اس طرح ان کا نام و نشان مٹ جاتا تھا، لیکن قرآن کہتا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے دراصل مراد یہ ہے کہ اس قوم سے قوت و سطوت اور غلبہ و حکومت چھن جاتے ہیں اور اس کی جگہ کوئی اور قوم لے لیتی ہے۔ اسے قانونِ استبدال و استخلافِ اقوام (LAW OF SUCCESSION & SUBSTITUTION OF NATIONS) کہا جاتا ہے۔ مثلاً سورۂ محمد میں ہے: هَآ أَنْتُمْ ..... الْفُقَرَآءُ ..... (۴۷/۳۸) دیکھو! تمہاری حالت یہ ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ تم (اپنی فاضلہ دولت کو) نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے دے دو تو تم میں وہ لوگ بھی ہیں جو ایسا کرنا نہیں چاہتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ساری کی ساری دولت سمیٹ کر اپنے مفاد کی خاطر جمع کر لی جائے۔ سو تمہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص دولت کو اس طرح سمیٹ کر دوسروں کو ان کی نشوونما سے محروم رکھنا چاہتا ہے وہ دراصل اپنی ذات کو نشوونما سے محروم رکھتا ہے۔ خدا نے جب تم سے کہا تھا کہ اس دولت کو دوسروں کی نشوونما کے لئے دے دو۔ تو یہ تمہارے ہی بھلے کی بات تھی؛ اسے تمہاری دولت کی ضرورت نہیں، وہ تمہارا محتاج نہیں۔ تم اس کے محتاج ہو۔ بہر حال تم اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔ اِنْ تَتَوَلَّوْا ..... أَمْثَالَكُمْ (۴۷/۳۸) "اگر تم صحیح نظامِ زندگی سے پھر گئے (جس میں معاشرہ کا فریضہ تمام نوعِ انسانی کی نشوونما ہوتا ہے) تو خدا تمہاری جگہ کسی اور قوم کو لے آئے گا، اور وہ تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔"

یہاں قرآن کریم نے اتنا ہی کہا ہے کہ وہ قوم جو تمہاری جگہ لے گی تمہارے جیسی نہیں ہوگی۔ دوسرے مقام پر کہا ہے کہ وہ تم سے بہتر ہوگی۔ إِنَّا لَقَادِرُونَ ..... مِنْهُمْ ..... (۷۰/۴۱) اس سے ظاہر ہے کہ جو قوم کسی دوسری کی جگہ لیتی ہے وہ جانے والی قوم سے بہر حال بہتر ہوتی ہے۔

قوموں کا باہمی تصادم، ایک تو مادی سطح پر ہوتا ہے۔ اس میں جس قوم کے پاس مادی قوت زیادہ ہو اسے غلبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ یعنی ان میں سے کسی کے پاس بھی صحیح نظام نہیں ہوتا۔ "جنگل کا قانون" ان کا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ٹکراؤ حیوانی سطح پر ہوتا ہے۔ اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وَكَذَٰلِكَ ..... يَكْسِبُونَ (۶/۱۲۹) "اس طرح ہم ظالموں کے ایک گروہ کو ظالموں کے دوسرے

مادی قوتوں کا ٹکراؤ

گروہ پر حاکم بنا دیتے ہیں" یا ایک ہی قوم میں خانہ جنگی شروع ہو جاتی ہے۔ خانہ جنگی کے معنی یہ ہیں کہ قوم کے سامنے واحد، مشترک، نصب العینِ حیات یا اجتماعی مقصد نہیں ہوتا۔ جس قوم میں یہ صورت پیدا ہو جائے، وہ قوم، قوم نہیں رہتی۔ یا تو منتشر افراد کا ہجوم بن جاتی ہے اور یا مختلف پارٹیوں میں بٹ جاتی ہے۔ دونوں صورتوں میں (افراد یا پارٹیوں کے) مفاد آپس میں ٹکراتے ہیں۔ مفادات کے اس ٹکراؤ سے خانہ جنگی اُبھرتی ہے۔ اس خانہ جنگی میں، یہ افراد یا پارٹیاں

اس خود فریبی میں مبتلا ہوتی ہیں کہ اس سے ان کے مفادات کا تحفظ ہوگا لیکن اس سے تحفظ کسی کے مفاد کا بھی نہیں ہوتا۔ ان تمام تصادمات کا نتیجہ تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ لیکن قرآن جس مقام کو ابھار کر سامنے لاتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک قوم کے پاس قوت اور دولت کی بھی کمی نہیں۔ تعداد بھی ان کی بہت ہے انہیں غلبہ اور اقتدار بھی حاصل ہے لیکن چونکہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے اس لئے وہ تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ روم میں۔ اَوَلَمْ یَسِیْرُوْا ..... یَظْلِمُوْنَ (۳۰/۹) کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں جو یہ دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہو گذری ہیں ان کا انجام کیا ہوا۔ وہ لوگ ان سے قوت میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ انہوں نے زمین کو زراعت کے قابل بنایا، اور اسے ایسا آباد کیا کہ ان لوگوں (قوم مخاطب) نے بھی ویسا آباد نہیں کیا۔ (لیکن ان کا نظام غلط تھا اس لئے ہمارے پیغمبر ان کے پاس آئے لیکن انہوں نے ان کی باتوں پر توجہ نہ دی اور تباہ ہو گئے) سو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا۔" دوسرے مقام پر قرآن کہتا ہے کہ یہ نہیں کہ یہ لوگ وحشی اور ظالم تھے۔ یہ عقل و بصیرت رکھتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود نہیں سمجھتے تھے کہ ان کا نظامِ معاشرہ کس قدر کمزور بنیادوں پر استوار ہے۔ چنانچہ وہ عاد و ثمود۔ (اقوامِ گذشتہ) کے متعلق کہتا ہے کہ وَقَدْ تَّبَیَّنَ ..... كَانُوْا مُسْتَبْصِرِیْنَ (۲۹/۳۸)" ان کی تباہی ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات سے ہویدا ہے۔ ان کی ذاتی مفاد پرستیاں ان کے غلط نظام کو ان کی نگاہوں میں نہایت درخشندہ اور تابندہ بنا کر دکھاتی تھیں۔ اور اس طرح انہیں صحیح راستے پر چلنے سے روکتی تھیں۔ حالانکہ وہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔" دوسرے مقام پر ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ ..... فِیْهِ (۴۶/۲۶)۔" ہم نے

علم و بصیرت کے باوجود تباہی

ان اقوام کو ایسا تمکن عطا کیا تھا جو تمہیں بھی نہیں دیا۔ وَجَعَلْنَا لَهُمْ ..... اَفْـِٕدَةً ..... اور ہم نے انہیں سمع و بصر اور قلب بھی عطا کیا تھا۔ ان کے ذرائع علم بہت وسیع تھے اور دانش و بینش سے بھی بہرہ وافر عطا ہوا تھا۔ فَمَاۤ اَغْنٰی عَنْهُمْ ..... یَسْتَهْزِءُوْنَ (۴۶/۲۶)" لیکن چونکہ وہ قوانینِ خداوندی سے انکار کرتے تھے اور معاشرہ کو اپنے خود ساختہ اصولوں کے مطابق چلاتے تھے اس لئے ان کے سمع و بصر اور قلب ان کے کسی کام نہ آئے اور انہیں اس تباہی نے آ لیا۔ جس پر وہ ہنسا کرتے تھے۔" یہ ہے وہ مقام جسے قرآن اُبھار کر سامنے لاتا ہے۔ یعنی ایک قوم کے پاس دولت کی فراوانیاں ہیں۔ سامانِ زیست کی کمی نہیں۔ قوت و سطوت۔ شوکت و حشمت۔ جاہ و جلال سب کچھ ہے۔ اس کے ساتھ دنیاوی علوم کی بھی کمی نہیں۔ لیکن ذاتی مفاد پرستی کے جذبات اس قدر شدید ہیں کہ وہ ان کے کانوں کو بہرہ اور ان کی آنکھوں کو اندھا کئے ہیں، اور انہیں نظر ہی نہیں آتا کہ جس راستے پر وہ چل رہے ہیں اس کا انجام کیا ہے۔ ان کے سامنے صحیح نظامِ خداوندی پیش بھی کیا جاتا ہے لیکن (چونکہ وہ ان کے عاجلانہ مفاد کے خلاف جاتا ہے اس لئے) وہ اس کی سخت

مخالفت کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کا نظام غلط بنیادوں پر استوار ہوتا ہے۔

سلطنتِ روما کا زوال

تاریخ تہذیب کا مشہور مؤرخ برفا (BRIFFAULT) سلطنت روما کی تباہی کے اسباب و علل پر بحث کرتا ہوا لکھتا ہے:۔

انسانی ہیئتِ اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ خواہ اس نظامِ باطل کو کیسے ہی تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم و ضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہو سکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے اس کے لئے تباہی مقدر ہے۔ روما کی سلطنت عام انسانوں کی لوٹ کھسوٹ سے ایک خاص جماعت کو متمول ..... بنانے کا ذریعہ تھی۔ انہوں نے "سوداگری" کو نہایت قابلیت اور تدبر، خلوص اور "دیانتداری" سے چلایا۔ لیکن حسنِ انتظام کی یہ تمام خوبیاں بنیادی باطل کو اس کے فطری نتائج سے نہ بچا سکیں۔ غلط بنیادوں کے اثرات بلا رو رعایت نتیجہ خیز ہو کر رہے۔

(THE MAKING OF HUMANITY — P 159)

آگے چل کر یہی مؤرخ لکھتا ہے:۔

اگر انسان بادلوں سے اونچا اڑنے لگ جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسانیت کی سطح بھی اتنی ہی بلند ہو گئی ہے نہ ہی سو میل فی گھنٹہ کی رفتار کے معنی ترقی ہیں۔ انسان اگر ستاروں کو تولنے کے قابل ہو جائے اور علوم و فنون کے وسیع میدانوں میں گھوڑے دوڑانے لگ جائے تب بھی اس کے جوہرِ ذاتی میں قلبِ ماہیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ انسانی معاملات اس سے کہیں گہرے ہوتے ہیں ..... قوت، تہذیب، کلچر بے معنی چیزیں ہیں اگر ان کے ساتھ اخلاقی برائیاں شامل ہوں۔ وہ صحیح پیمانہ جس سے انسانی دنیا کی قدر و قیمت ماپی جا سکتی ہے، اخلاقی پیمانہ ہی ہے۔ (صفحہ ۲۵۹)

اس قسم کے غلط نظام کے مآل و انجام کے متعلق وہ کہتا ہے:۔

وہ نظامِ تہذیب جس میں حق و صداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی فرد کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے اس ناانصافی کی وجہ سے انجامِ کار برباد ہو جاتی ہے۔ انتخابِ طبیعی کے اٹل قانون کی بنا پر گناہ کی اُجرت موت ہے۔ (صفحہ ۲۶۲)

یہ تو ایک قدیم تمدن کی تباہی کے اسباب و علل کا تجزیہ تھا۔ تہذیبِ مغرب، جس کی چمک دمک اچھے اچھے دیدہ وروں کی نگاہ میں خیرگی پیدا کر دیتی ہے، اس کے انجام و مآل کے متعلق خود مغرب کے مفکرین

جس بُری طرح واویلا مچا رہے ہیں، اس پر ان کے آئے دن شائع ہونے والی تصانیف و مقالات شاہد ہیں (RENE GUENON) اپنی تصنیف (THE CRISIS — OF MODERN WORLD) میں لکھتا ہے:-

تہذیبِ مغرب کا مآل

عہدِ حاضر کی تہذیب رفتہ رفتہ تنزّل کی طرف گرتی گئی ہے حتیٰ کہ یہ انسان کے پست ترین عناصر کی سطح پر جا کر غرق ہو گئی ہے۔ اس کا نصب العین اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسانی فطرت کے محض مادّی گوشے کے تقاضوں کی تسکین کا سامان فراہم کیا جائے۔ یہ نصب العین خود ایک فریب ہے۔ اس لئے کہ یہ جس قدر انسانی ضروریات کو پورا کر سکتا ہے اس سے زیادہ مصنوعی ضروریات کو پیدا کر دیتا ہے..... اس عہد کے انسان نے صرف اپنی ذہنی کاوشوں کو مشینوں کی ایجاد اور ساخت کے لئے وقف کر رکھا ہے بلکہ وہ خود رفتہ رفتہ مشین بن چکا ہے

یہ ایجادات جن کا شمار دن بدن بڑھتا جا رہا ہے اور بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ اس لئے کہ وہ ان قوتوں کو بروئے کار لا رہی ہیں جن کی اصل حقیقت کا علم ان انسانوں کو نہیں جو انہیں استعمال کرتے ہیں..... جو لوگ مادہ کی وحشی قوتوں کو بے لگام چھوڑ دیتے ہیں وہ خود انہی قوتوں کے ہاتھوں تباہ ہو جاتے ہیں..... دورِ حاضر میں مادّی قوتوں کو کھلا چھوڑ دیا گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ مادّہ اس انسان کو برباد کر دے گا جو خود مادّہ سے بلند ہوئے بغیر اس کی تسخیر چاہتا ہے۔ اس لئے بعید نہیں کہ موجودہ دنیا خود ان ایجادات ہی کے ہاتھوں تباہ ہو جائے۔

یہ تو ہے اس تہذیب کے ہاتھوں معاشرہ کی حالت۔ فرد کی حالت اس سے بھی زبوں تر ہے۔ ڈاکٹر ینگ، اپنی عمر بھر کی تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ

عصرِ حاضر کا انسان مصلوبِ انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں یعنی ان حوادث کے مقابلہ میں ہراساں جن پر وہ اپنے دور کی سیاسی و مادّی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی حالت۔ اور اگر وہ اس خارجی دنیا سے ہٹ کر اپنی داخلی دنیا کی طرف جھانکتا ہے، تو وہاں اسے باہر سے بھی زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ (MODERN MAN IN SEARCH OF SOUL)

یہی وہ انسان ہے جس کے متعلق حکیم الامّت (اقبالؔ) نے بہت پہلے کہا تھا کہ

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا — اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا — زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

"زندگی کی شبِ تاریک" میں نورِ سحر، ان مستقل اقدار کے خورشید جہاں تاب سے آئینہ پاش ہوتا ہے، جو وحی کے ذریعے ملتی ہیں اور جو آج قرآن کی دفتین میں محفوظ ہیں۔ جب تک دنیا کا نظام ان اقدار کی بنیادوں پر قائم نہیں ہوتا، تاریکیاں چھٹ نہیں سکتیں۔

اس مقام پر یہ اہم سوال سامنے آتا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جس کے نہ ہونے سے قومیں اس قدر دولت و حشمت، قوت و تمکن، تعقل و دانش اور علم و بصیرت کے باوجود تباہیوں کے جہنم میں جا گرتی ہیں؟ یہ سوال بڑا اہم ہے۔ لیکن قرآن نے اس کا جو جواب دیا ہے جوں جوں نگاہ بصیرت اس پر غور کرتی ہے انسان وجد میں آجاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو!

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ (۸/۵۳)

یہ اس لئے ہوتا ہے کہ اللہ نے جو نعمت کسی قوم کو دے رکھی ہے وہ اس سے، کبھی نہیں چھینتا تاوقتیکہ وہ قوم اپنے اندر، اپنی نفسیاتی دنیا میں تبدیلی نہ کر لے۔ یاد رکھو! اللہ سب کچھ سننے والا۔ دیکھنے والا ہے۔

داخلی تبدیلی

قرآن نے اس چھوٹی سی آیت میں قوموں کے عروج و زوال کا وہ فلسفہ بیان کر دیا ہے جو بڑی بڑی ضخیم مجلدات میں بھی نہیں سما سکتا، وہ کہتا ہے کہ خارجی دنیا دراصل، انسان کی داخلی دنیا کا عکس ہوتی ہے۔ جب تک اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی نہ ہو اس کی خارجی دنیا میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ پھر جس قسم کی تبدیلی اس کی داخلی دنیا میں ہوگی اسی قسم کی تبدیلی اس کی خارجی دنیا میں ہو جائے گی۔ اس کی داخلی دنیا میں تبدیلی اس چیز سے ہوتی ہے۔ جسے قرآن اپنی اصطلاح میں "ایمان" سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی صحیح زاویۂ نگاہ۔ راست نصب العین حیات۔ وحی کی عطا کردہ مستقل اقدار پر یقین محکم۔ اس سے انسان کی داخلی قوتیں ایک نقطہ پر مرکوز ہو جاتی ہیں اور اس سے ایسے محیر العقول نتائج مرتب ہوتے ہیں جن کا تصور بھی ویسے نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وہ "شے" ہے جس کے فقدان کا رونا روتے ہوئے برٹرینڈ رسل لکھتا ہے کہ

ایمان کا فقدان

ہماری موجودہ مشکل یہ ہے کہ ہم نے خارجی قوتوں کو تو بے حساب انداز سے مسخر کر لیا ہے لیکن ان قوتوں کو قطعاً مسخر نہیں کیا جو خود ہمارے اندر ہیں۔ ضبط نفس ہمیشہ معلمین اخلاق کا سب سے پہلا سبق رہا ہے۔ لیکن زمانہ سابقہ میں اس کا کوئی واضح مفہوم سامنے نہیں ہوتا تھا (اس کا مفہوم یہی ہے کہ خارجی قوتوں کو کس طرح صحیح اقدار کے تابع صرف کیا جائے)۔

(AUTHORITY AND INDIVIDUAL)

ڈاکٹر ینگ (جس کا ذکر ابھی ابھی کیا جا چکا ہے) اس باب میں لکھتا ہے:۔

میں نے اپنی زندگی کے نصف آخر میں جس قدر مریضوں کا تجزیہ نفس کیا ان میں سے ایک بھی ایسا نہ تھا جسے زندگی کے مسائل کے حل کے لئے مذہبی زاویۂ نگاہ کی تلاش نہ ہو۔ ان میں سے ہر ایک کی بیماری کی وجہ یہ تھی کہ اس نے اس "شے" کو ضائع کر دیا تھا جو زندہ مذہب انسان کو مہیا کرتا ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ انہیں پھر سے وہی "شے" دے دی جاتی جو ان سے گم ہو چکی تھی۔

یہی ان کی دوا تھی ـــــ عقیدہ، اُمید، محبت، نگہ خود بین (ص ۲۶۴)

عصرِ حاضر کے ان محققین و مؤرخین کی یہ تمام تحقیقات تشریح و توضیح ہیں قرآن کی اس آیت کی جسے ہم نے اوپر درج کیا ہے۔ یعنی اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ ..... بِاَنْفُسِہِمْ ..... (۱۳/۵۳) قرآن قوموں کے عروج و زوال کا راز، ان کے تغیرِ نفس میں بتاتا ہے اور تغیرِ نفس پیدا ہوتا ہے۔ وحی کی اقدار پر یقینِ محکم سے۔

(۰)

اُوپر کا طبقہ پہلے بگڑتا ہے

قرآن ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ قوموں میں خرابیوں کی ابتدا ان کے اوپر کے طبقے سے شروع ہوتی ہے اور وہاں سے پھیل کر یہ نیچے کے طبقے کو متاثر کرتی ہیں۔ وَکَذٰلِکَ ..... لِیَمْکُرُوْا فِیْہَا ..... (۶/۱۲۴) "یہ بڑے بڑے مجرمین اس امر کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں کہ ان کے قائم کردہ غلط نظام کے بندھن ڈھیلے نہ ہونے پائیں"۔ "یہ اکابر مجرمین" وہ ہیں جو دوسروں کی کمائی پر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وَاتَّبَعَ الَّذِیْنَ ..... مُجْرِمِیْنَ ..... (۱۱/۱۱۶) "یہ لوگ اپنی مفاد پرستیوں اور عیش سامانیوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور اس طرح ظلم و استبداد اور سلب و نہب کا چلن عام ہو جاتا ہے۔ یہی لوگ ہیں جو کاروانِ ملت کے قافلہ سالار بنتے ہیں لیکن قافلہ کو تباہیوں کے گھر میں جا کر اتار دیتے ہیں۔ سورۂ ابراہیمؑ میں ہے۔ اَلَمْ تَرَ ..... بِئْسَ الْقَرَارُ ..... (۱۴/۲۸-۲۹) "کیا تو نے ان لوگوں کی حالت پر غور نہیں کیا جو خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی ناسپاس گذاری کرتے ہیں اور قوم کے قافلہ کو اس منڈی میں لے جاتے ہیں جہاں اس جنسِ کاسد کا کوئی خریدار نہیں ہوتا۔ یعنی اسے تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا اتارتے ہیں۔ ..... اور وہ کیسی بُری منزل ہے"۔

لیکن قرآن لیڈروں کو موردِ الزام قرار دے کر، عوام کو بری الذمہ نہیں ٹھہرا دیتا، وہ انہیں بھی برابر کا مجرم قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ عوام بھی بہرحال انسان ہوتے ہیں اور انسانوں کی طرح وہ بھی سمجھنے سوچنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہوتے ہیں۔ بنابریں وہ عوام کی ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ کھرے کھوٹے کی پہچان کریں اور صرف اسی راستے پر چلیں جو عافیت اور سلامتی کا راستہ ہو۔ قرآن نے اس حقیقت کو بڑے دلآویز انداز میں بیان کیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ لیڈر اور ان کے متبعین (FOLLOWERS) دونوں جہنم میں جمع ہوں گے اور ایک دوسرے کو طعن و تشنیع کریں گے۔ عوام لیڈروں سے کہیں گے کہ تم نے ہمیں تباہ کیا۔ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور صحیح راستے پر چلتے۔ (۳۴/۳۱)۔ لیڈر اس کے جواب میں کہیں گے کہ قصور سارا تمہارا اپنا ہے اور ناحق الزام ہم پر دھرتے ہو۔ صحیح راستہ تمہارے سامنے تھا۔ اگر تم اس پر چلنا چاہتے تو تمہیں کون روک سکتا تھا؟ ہم نے تمہیں کبھی نہیں کہا کہ تم صحیح روش زندگی چھوڑ کر ہمارے پیچھے لگو۔ مجرم تم خود ہو اور الزام ہمارے سر دھرتے ہو۔ (۳۴/۳۲) اس کے جواب میں عوام کہیں گے کہ یہ ٹھیک ہے کہ تم زبان سے تو ہمیں نہیں کہتے تھے کہ ہم جرائم کے مرتکب ہوں۔ لیکن تم دن رات اس قسم کی سازشوں اور تدبیروں میں لگے رہتے تھے جن سے بچ نکلنا سادہ لوح عوام کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس طرح تم بالواسطہ ہمیں مجبور کر دیتے تھے کہ ہم

جہنم میں عوام اور لیڈروں کا مکالمہ

قوانینِ خداوندی کو چھوڑ کر تمہاری تجویز کردہ راہوں ... چل نکلیں (۳۳/۶۷) دوسری جگہ ہے کہ یہ متبعین خدا سے درخواست کریں گے کہ ہمارے یہ بڑے بڑے لیڈر جنہوں نے اپنے سامنے ہمیں بھی تباہ کیا ہے، انہیں دوگنا عذاب دیجئے۔ ایک حصّہ ان کے اپنے جرائم کا اور ایک حصّہ ان جرائم کا جو انہوں نے ہم سے کرائے۔ (۳۳/۶۷-۶۸)

ان، اور اسی قسم کے دیگر کئی ایک مقامات میں لیڈروں اور عوام کے اس قسم کے مکالمات کے تمثیلی بیان سے اس حقیقت کو واضح کیا گیا ہے کہ قوموں کی تباہی میں عوام اور اکابر دونوں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ اکابر اس لئے کہ وہ اپنی مفاد پرستیوں کی خاطر عوام کو اپنا آلۂ کار بناتے ہیں۔ اور عوام اس لئے کہ وہ ان غلط کار اکابرین کی ہوس پرستیوں کے آلۂ کار بننے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ لیڈروں کی قوت درحقیقت عوام ہی سے ہوتی ہے۔

پھر جس طرح ایک قوم کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے متاثر ہو کر تباہی اور بربادی کی زنجیروں کی مختلف کڑیاں بنتے ہیں، اس طرح ایک قوم، دوسری قوموں کی نقالی سے تباہی کے جہنّم میں جا گرتی ہے۔ سورۂ اعراف میں ہے کہ كُلَّمَا دَخَلَتْ أُمَّةٌ لَّعَنَتْ أُخْتَهَا..... (۷/۳۸) "جب ایک قوم جہنّم میں داخل ہو گی تو وہ اپنی بہن، دوسری قوم پر لعنت کرے گی (کہ ہمیں اس نے تباہ کیا) حَتَّىٰ إِذَا ادَّارَكُوا فِيهَا..... مِنَ النَّارِ..... (۷/۳۸) یہاں تک کہ جب تمام اقوام تباہی کے جہنّم میں اکٹھی ہو جائیں گی تو بعد میں آنے والی قومیں اپنی پیش رو قوموں کے متعلق کہیں گی کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں! انہوں نے گمراہ کیا تھا سو انہیں دوگنا عذاب دے۔ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلَٰكِن لَّا تَعْلَمُونَ (۷/۳۸) اس کے جواب میں ان سے کہا جائے گا کہ تم میں سے ہر ایک کے لئے دوگنا عذاب ہے۔ اس لئے کہ اگر پیش رو

تابع اور متبوع قومیں

قومیں اس لئے دوگنے عذاب کی مستحق ہیں کہ انہوں نے دوسروں کو گمراہ کیا تو ان کے پیچھے لگنے والی قومیں اس لئے دوہرے عذاب کی سزاوار ہیں کہ وہ آنکھیں بند کر کے ان کے پیچھے کیوں لگیں؟ واضح رہے کہ قرآن کے نزدیک اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینا اور دوسروں کی اندھی تقلید کئے جانا ایسی روش ہے جو افراد اور اقوام دونوں کو سیدھا جہنّم کے گڑھے میں جا گراتی ہے اس لئے قرآن کی رُو سے ہر قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی عقل و فکر سے کام لے اور جو راہ قوانینِ خداوندی نے متعیّن کی ہے اس پر چلے۔ اس سے وہ شادابیوں اور سرفرازیوں کی جنّت کے راستے پر چل نکلے گی۔ لیکن اگر اس نے اپنی دانش و بینش سے کام لینا چھوڑ دیا تو اس کا یہی جرم اس کی تباہی کے لئے کافی ہو گا۔ قرآن تو اچھی روش پر بھی بلا سوچے سمجھے چلنے کی اجازت نہیں دیتا (۱۷/۳۶) چہ جائیکہ کسی دوسری قوم کی تقلید محض اس لئے کی جائے کہ اسے دنیا میں زیادہ قوّت و اقتدار حاصل ہے۔ (جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں) عارضی غلبہ و اقتدار اور دولت و ثروت (کچھ عرصہ کے لئے) غلط نظام سے بھی حاصل ہو جاتا ہے لیکن اس کا انجام بہرحال تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ وَكَمْ أَهْلَكْنَا..... نَّحْنُ الْوَارِثِينَ (۲۸/۵۸) کتنی بستیاں ایسی تھیں جنہیں ہم نے سامانِ زیست کی فراوانیوں کے باوجود تباہ و برباد کر دیا، (اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ غلط بنیادوں پر استوار تھا) یہ دیکھو! ان کے مکانات ہیں جو ان کے بعد بہت کم آباد ہوئے اور ان کے وارث

ہم ہی ہوئے" فَهِيَ خَاوِيَةٌ ..... قَصْرٍ مَّشِيْدٍ ..... (۲۲/۴۵) "ان کے رفیع الشان محلات کھنڈرات بن گئے۔ ان کے کنوئیں ویران ہو گئے۔ ان کا نام و نشان مٹ گیا۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ ..... (۲۳/۴۴) اور ان کی فقط داستانیں باقی رہ گئیں" قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ..... مُجْرِمِيْنَ (۲۷/۶۹)۔ ان سے کہو کہ تم مختلف ممالک کی سیر کرو اور ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے پوچھو کہ غلط رو قوموں کا انجام کیا ہوتا ہے؟

اس طرح قرآن اقوامِ گذشتہ کے احوال و کوائف سامنے لا کر (تاریخی شواہد کے مطالعہ سے) اس حقیقت کی طرف راہ نمائی کرتا ہے کہ غلط نظامِ زندگی کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ ان تاریخی نوشتوں سے وہی قومیں سامانِ عبرت حاصل کر سکتی ہیں جو عقل و فکر سے کام لیتی ہیں۔ سورۃ الحج میں ہے۔ اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا ..... يَسْمَعُوْنَ بِهَا ..... (۲۲/۴۶) "کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ ان کے لئے دل ہوتے جن سے وہ سمجھتے۔ یا کان ہوتے جن سے وہ سنتے۔ فَاِنَّهَا لَا تَعْمَى ..... فِي الصُّدُوْرِ ..... (۲۲/۴۶)" اس لئے کہ انسان کی (ماتھے کی) آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں بلکہ وہ دل اندھے ہوتے ہیں۔ جو سینے کے اندر ہیں"۔

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے، کسی قوم کے عروج و زوال، اور اس کی موت و حیات کا فیصلہ اس نظام کے مطابق ہوتا ہے جسے وہ قوم اپنے لئے اختیار کرتی ہے۔ ایسے نظام کی اساس و بنیاد، اس کے اجزائے ترکیبی، اور مابہ الامتیاز خصوصیات کیا ہیں، جو قوموں کے عروج و بقا کا ضامن بنتا ہے، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ لیکن اس ضمن میں قرآنِ کریم نے جو بنیادی اصول دیا ہے وہ اس قابل ہے کہ اسے دوبارہ سامنے لایا جائے اور وہ اصول یہ ہے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ..... (۱۳/۱۷)

وہی نظریۂ حیات، وہی اصولِ زندگی، وہ نظامِ معاشرہ، دنیا میں باقی رہ سکتا ہے جو تمام نوعِ انسان کے لئے نفع رساں ہو۔ یعنی ایک تو وہ نفع رساں اور منفعت بخش ہو، اور دوسرے یہ اس کی منفعت بخشی، کسی خاص گروہ: خاص پارٹی، خاص ملک، خاص قوم تک محدود نہ ہو، بلکہ وہ ساری انسانیت کے لئے نفع رساں ہو۔

یہ ہے وہ عالمگیر اصول جس کی بنیادوں پر قرآن اپنا نظامِ زندگی استوار کرتا ہے اور یہی اصول قوموں کی زندگی کا حقیقی ضامن بن سکتا ہے۔

نظامِ ربوبیت

آپ ایک عرصہ سے سنتے چلے آرہے ہیں کہ اسلام، نہ نظامِ سرمایہ داری کا حامی ہے نہ کمیونزم کا۔ اس کا اپنا منفرد معاشی نظام ہے۔ جس میں نوعِ انسان کی مشکلات کا حل مضمر ہے۔ لیکن کسی نے یہ نہ بتایا کہ اسلام کا وہ معاشی نظام ہے کیا؟

(یہ پہلے ایڈیشن سے کہیں مختلف ہے) مفکرِ قرآن، پرویز صاحب کی اس تصنیف میں نہایت وضاحت بتایا گیا ہے۔

(۱) نظامِ سرمایہ داری کیا ہے۔ کمیونزم اور سوشلزم کے نظام کیا ہیں۔ اور یہ کیوں ناکام رہ گئے ہیں۔ اور ان کے برعکس (۲) اسلام کا وہ معاشی نظام کیا ہے جو نوعِ انسانی کی مشکلات کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے ــــ اس کتاب کے بعد آپ کو معاشیات کے موضوع پر کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں رہے گی۔

* کتاب آفسٹ پر چھپائی میں ولائتی سفید کاغذ پر طبع کی گئی ہے ــــ ضخامت ۴۰۰ صفحات ــــ مجلد ــــ قیمت فی جلد ۔/۵۰ روپے